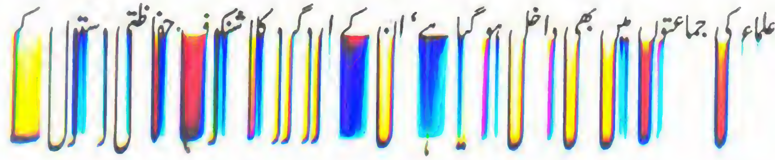
فہرست

پیش لفظ

آج کے سیاسی حالات میں اس کتاب کی اہمیت اس لئے ہے کہ یہ علماء کے سیاسی کردار کا تاریخی جائزہ' ان کی موجودہ سیاسی سرگرمیوں اور ان کے مقاصد کو سمجھنے میں مدد دے گی کیونکہ اس وقت علماء جس طرح سے سیاست میں داخل ہوئے ہیں' ان کا یہ رول پاکستان کے ابتدائی دنوں میں نہیں تھا۔

1970ء کی دھائی میں جب سے انہیں عرب ملکوں سے امداد ملنی شروع ہوئی ہے ان کا سیاسی کردار ان کے مذہبی کردار سے زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ بلکہ ان میں سے کچھ تو ایسی جماعتیں ہیں جو محض سیاسی بن کر رہ گئی ہیں' جس کی وجہ سے علماء کا کردار جو اب تک تھا بہت حد تک بدل چکا ہے' دین کی تبلیغ یا مذہب کے دفاع کے بجائے اب ان کا مقصد اقتدار پر قبضہ کرنا' اقتدار میں شرکت کرنا ہے' اس طرح سے دین کی اہمیت گھٹ کر ثانوی رہ گئی ہے۔

لہذا سیاسی اقتدار کی جنگ میں' تشدد کا جو عنصر دوسری سیاسی جماعتوں میں ہے وہ



علماء کی جماعتوں میں بھی داخل ہو گیا ہے' ان کے ارد گرد کا شکوہ' حفاظتی دستوں کے نظر آنے' اور شان و شوکت والے طرز رہائش کو اختیار کرنے سے ان کی تشخیص عالموں والی نہیں رہی ہیں' بلکہ یہ بھی جاگیرداروں کی صف میں شامل ہو گئے ہیں۔

لیکن پاکستان اور دوسرے مسلم ملکوں میں جو فرق ہے وہ یہ کہ اس شان و شوکت کی علامتوں کو اختیار کرنے کے باوجود' یہ انتخابات میں کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں' کیونکہ لوگ اب بھی سیاست اور مذہب کو علیحدہ سمجھتے ہیں' اور علماء کے کردار کو صرف مسئلہ مسائل سمجھنے کی حد تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

پاکستان میں علماء کی جماعتیں اس لئے مقبولیت حاصل نہیں کر سکیں کیونکہ ایوب خان کے بعد سے ان کا تعلق کسی نہ کسی طرح سے اقتدار کے ساتھ رہا ہے اور جہاں آمریت ناکام ہوئی' وہاں علماء بھی آمروں کے ساتھ تعاون کرنے پر غیر مقبول ہوئے۔

ہمارے سیاستدانوں کی بدعنوانیوں اور نا اہلی کے باوجود علما کی جماعتیں نعم البدل کے طور پر اس لئے ابھر کر نہیں آ سکیں کہ ان کے تاریخی کردار کی جو یادیں لوگوں کے ذہن میں ہیں' وہ انہیں اس بات سے روکتی ہیں کہ اقتدار ان کے حوالے کیا جائے۔ اس لئے علماء پس منظر میں رہتے ہوئے تو اپنے اثر کو استعمال کر رہے ہیں' اور سیاسی جماعتیں ان کے اثر سے ڈر کر ان کے منشور کو اختیار کر رہی ہیں' مگر جہاں تک عوام کا تعلق ہے' ان کا ذہن ابھی تک سیکولر ہے' اس سیکولر ذہن کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں جو شک و شبہات ہیں انہیں دور کیا جائے۔ یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

ستمبر 1993ء' لاہور

تعارف

دنیا کے بڑے مذاہب جن میں آج پیشہ ور مذہبی گروہ موجود ہیں ان کے ابتدائی دور میں کسی خاص ایسے طبقے یا جماعت کا وجود نہیں تھا کہ جسے مذہبی امور اور معاملات میں مہارت حاصل ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابتدا میں ہر مذہب کی تعلیمات اس کے اصول اور قوانین انتہائی سادہ تھے جو کہ آسانی سے ہر فرد کی سمجھ میں آ جاتے تھے اور جن پر آسانی سے عمل بھی کیا جاتا تھا۔ مگر جیسے جیسے یہ مذاہب پھیلے' اس کے ساتھ ہی ان میں مختلف سماجی و ثقافتی گروہ شامل ہوتے گئے اور جب یہ مذاہب ایک سیاسی طاقت بن گئے تو ان کے ڈھانچہ میں زبردست تبدیلی آئی کیونکہ اب مذہب کو ایک سادہ معاشرہ کے بجائے ایک وسیع' پیچیدہ معاشرے کے سیاسی' سماجی اور معاشی حل کرنا تھے اور ان مسائل کے حل کے لئے قوانین وضع کرنا تھے' لہٰذا اس صورت حال میں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک ایسا طبقہ وجود میں آئے کہ جو مذہبی تعلیمات اور مذہبی امور میں ماہر ہو اور جو مذہبی معاملات میں معاشرہ کی راہنمائی کر

سکے۔

ایک مرتبہ ایسا طبقہ وجود میں آگیا' تو اس نے اپنے اقتدار اور طاقت کو محدود کرنے کے بجائے اور پھیلانا شروع کر دیا۔ خاص طور پر روزمرہ کی زندگی میں جو رسومات تھیں ان کی ادائیگی کا ذمہ اس نے اٹھا لیا' اور پھر ان رسومات کی ادائیگی کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا گیا کہ صرف وہی ان کو پورا کرنے کے اہل ہو گئے یہ صورت حال ہندو مذہب میں ہے کہ جہاں مذہبی رسومات کی ادائیگی صرف برہمن طبقہ ہی کر سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ذات پات کی تقسیم کے ابتدائی دور میں اگرچہ اولیت کشتری طبقہ کو تھی مگر بعد میں اس کا درجہ دوسرا ہو گیا اور برہمن کو اولیت مل گئی۔ پھر برہمن نے اپنی مالی حیثیت کو مضبوط کرنے کے لئے رسومات کی ادائیگی اس قدر مہنگی کر دی کہ ایک عام آدمی کے لئے وہ ایک بوجھ بن گئی۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان میں بدھ مذہب نے اس کے خلاف بغاوت کی۔ مگر بعد میں خود اس کے ہاں بھی بھکشوؤں کا ادارہ وجود میں آگیا اور ایک عام آدمی ان کے ہاتھوں استحصال کا شکار ہو گیا۔

یہی کچھ عیسائیت میں ہوا' کہ جہاں ابتداء میں کوئی مذہبی جماعت نہیں تھی۔ مگر بعد میں نہ صرف ایک طاقت ور مذہبی جماعت وجود میں آئی بلکہ چرچ اور پوپ کے قائم ہونے کے بعد یہ ایک موثر جماعت بن گئی۔

اسلامی معاشرہ میں بھی اسی عمل کو دھرایا گیا۔ اس کے ابتدائی دور میں جب کہ مسائل اس قدر پیچیدہ نہیں تھے۔ مذہب کی تعلیم کو ہر فرد آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا تھا لیکن جب فتوحات اور مذہب کی تبدیلی کی وجہ سے بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہونا شروع ہوئے تو اسلامی معاشرہ قبائلی دور سے نکل کر جاگیردارانہ اور ملوکیت کے دور میں داخل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی معاشرہ میں لاتعداد ایسے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے

کہ جن کے بارے میں کوئی واضح احکامات نہیں تھے۔ لہٰذا ان کے حل کے لئے ایک پیشہ ور طبقہ وجود میں آیا۔ تاکہ مسلمان معاشرہ کی ہدایت کا کام سنبھال سکے۔

علماء کے اس طبقہ نے اپنی پوری زندگی مذہبی تعلیم کے حصول کے لئے وقف کر دی اور قرآن حدیث' فقہ اور تفسیر کے مطالعہ کے بعد وہ خود کو اس قابل پاتے تھے کہ وہ معاشرہ کے سیاسی' معاشی' اور سماجی مسائل کا حل مذہب کی روشنی میں دے سکیں۔ لہٰذا شادی طلاق اور وراثت سے لے کر روزمرہ کی زندگی کے معاملات' کہ غسل کیسے کیا جائے؟ لباس کس قسم کا ہو؟ اور کھانا کیسے کھایا جائے؟ وغیرہ تک کے مسائل میں لوگ ان سے پوچھنے لگے۔

دوسری طرف حکومت نے عدالتی امور اور انتظامیہ میں ان کا تقرر کرنا شروع کر دیا۔ جن میں قاضی' مفتی اور صدر کے عہدے قابل ذکر ہیں۔ ان حیثیتوں میں علماء مذہبی تعلیمات اور اپنے علم کی روشنی میں فتوے دیا کرتے تھے کہ جس پر عمل کرنا ہر مسلمان کے لئے ضروری تھا۔

اس طرح آگے چل کر علماء کی دو قسمیں وجود میں آئیں۔ ایک وہ جو کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور حکومت کے اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ جبکہ کم تعلیم یافتہ مولوی مسجدوں کے امام اور خطیب بن گئے اور اس طرح ان دونوں اقسام کے علماء نے معاشرہ میں علیحدہ علیحدہ کردار ادا کئے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ علماء حکومت کے عہدے داروں کی حیثیت سے پیچیدہ قسم کے سیاسی سماجی اور معاشی مسائل کا حل پیش کرتے تھے۔ جب کہ دوسری قسم کے مولوی پیدائش' شادی اور موت کی رسومات کی ادائیگی کرتے تھے۔

شیعوں میں علماء کی درجہ بندی ان کے علم اور تجربہ کی بنیاد پر کی گئی ہے اور اس

میں ہر عالم کو موقع ملتا ہے کہ وہ ایک درجہ سے دوسرے درجہ میں جا سکے۔ ان میں مجتہد' آیت اللہ' امام' اور فقیہہ کے درجات ہیں۔ اس طرح درجہ کے لحاظ سے ہر ایک کے علیحدہ فرائض ہیں۔

علماء نے معاشرے کے دوسرے طبقوں سے خود کو علیحدہ سے شناخت کرنے کی غرض سے اپنا علیحدہ لباس مخصوص کر لیا ہے اور اب صورت حال یہ ہے کہ ہر مسلک کے علماء کا علیحدہ لباس' داڑھی کی مخصوص تراش اور پگڑی یا ٹوپی ہوتی ہے' جو اس کے فرقہ یا جماعت کی پہچان ہو جاتی ہے۔ جب بھی لوگ ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو ان کے نام کے ساتھ مولوی صاحب یا مولانا کا اضافہ کرتے ہیں اونچے درجہ کے عالم خود کو علامہ کہلانا پسند کرتے ہیں۔

اس لئے یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ اسلام میں کسی مذہبی گروہ کا وجود نہیں' علماء کی شکل میں یہ مذہبی طبقہ موجود ہے اور ہر وہ شخص جو مسلمان گھرانہ میں پیدا ہوا ہے اس کی زندگی میں پیدائش سے لے کر موت تک مولوی کا وجود ہوتا ہے اور سیکولر ہونے کے باوجود ایک مسلمان اس پر مجبور ہے کہ روزمرہ کے مسائل میں ان کے مشورہ کو تسلیم کرے۔

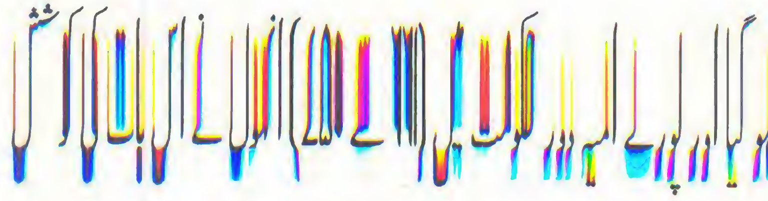
یہی وجہ ہے کہ اردو کے بہت سے اخباروں میں ہر ہفتہ مسئلہ مسائل کا ایک کالم آتا ہے کہ جس مین مولوی فتوے دے کر ان کا حل پیش کرتا ہے اور اس طرح علماء عام آدمی کی زندگی سے لے کر اس کے روز مرہ کے معاملات اور پبلک لائف میں عمل دخل کرتے ہیں۔ مسلمان معاشرہ میں چونکہ مذہب زندگی کے ہر شعبہ میں پیوست ہے اس لئے ہر نیا کام شروع کرنے سے پہلے یا ہر نئی چیز اختیار کرتے وقت اس بات کی ضرورت سمجھی جاتی ہے کہ اس کے بارے میں علماء سے رائے لے لی جائے کہ یہ

مذہب کے مطابق ہے یا نہیں- اس رجحان کی وجہ سے مسلمان معاشرہ میں علماء کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور وہ ان معاملات پر بھی مشورے دیتے ہیں کہ جن کے بارے میں ان کا علم محدود ہوتا ہے- اس لئے اکثر متضاد فتوے دے دیئے جاتے ہیں جو مسائل کو حل کرنے کے بجائے انہیں اور الجھا دیتے ہیں- یہی وجہ ہے کہ آبادی کے کنٹرول' انشورنس' بنکنگ اور انٹریسٹ کے مسائل اب تک مذہبی طور سے حل نہیں ہوئے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ علماء بدلتے ماحول اور اس کے تقاضوں سے ناواقف ہیں-

علماء اور دفتری (بیوروکریٹس)

اسلامی تاریخ کے اولین دور میں' مذہبی لوگوں کا ایک، ایسا طبقہ پیدا ہوا جو کہ خانہ جنگیوں اور مسلمانوں کے قتل عام سے انتہائی بددل تھا۔ اور اس لئے یہ سمجھتا تھا کہ ان حالات میں سیاست میں حصہ لینا اور کسی ایک جماعت کا ساتھ دینا اس کے مترادف ہے کہ مسلمانوں کو تباہ و برباد کیا جائے' ان کے اتحاد کو توڑا جائے اور ان کی طاقت کو کمزور کیا جائے مگر اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے ذہن میں یہ بھی تھا کہ وہ حالات کے سامنے کمزور ہیں اور ان میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ ان کا رخ موڑ سکیں یا تبدیلی لا سکیں۔ اس لئے اس گروہ میں سیاست کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہوئے اور انہوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ دنیاوی معاملات کو ترک کرکے مذہب میں سہارا لیا جائے اور مذہبی تعلیمات کو حاصل کرکے اس بات کی کوشش کی جائے کہ لوگوں کی اخلاقی اور روحانی زندگی سدھر سکے۔

اس صورت حال میں مذہبی لوگوں یا علماء کا یہ گروہ سیاست سے بالکل کنارہ کش


ہو گیا اور پورے امیہ دور حکومت میں (۶۶۱ سے ۷۵۰ء) انہوں نے اس بات کی کوشش

کی کہ حکومت سے دور رہ کر مذہبی تعلیمات کے حصول میں خود کو وقف کر دیا جائے۔ ان میں اور امیہ خاندان میں اس وجہ سے بھی تصادم نہیں ہوا کہ انہوں نے اپنی حکومت میں عربی روایات و اقدار کو باقی رکھا اور ان کا تحفظ کیا اور ایک طرح سے انہوں نے مطلق العنانیت کو اختیار نہیں کیا بلکہ عربی قبائلی روح کو برقرار رکھا۔ اس وجہ سے ان کے دور حکومت میں عربوں کا غیر عربوں پر تسلط قائم رہا اور انہیں جو مراعات ملیں ان کی وجہ سے وہ حکومت کے خلاف نہیں ہوئے۔

لیکن یہ صورت حال اس وقت تبدیل ہوئی جبکہ امیہ خاندان کے خلاف عباسیوں نے تحریک چلائی اور جو بالاخر ۷۴۹ء میں کامیاب ہوئی۔ جس کے نتیجہ میں امیہ خاندان کا تختہ الٹ دیا گیا اور ان کی جگہ عباسی خاندان نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ چونکہ عباسی انقلاب ایرانیوں کی وجہ سے کامیاب ہوا تھا اس لئے نئی حکومت میں ایرانیوں کا تسلط بڑھ گیا اور خلیفہ کے دربار میں تمام اعلیٰ عہدے ایرانیوں کو مل گئے۔

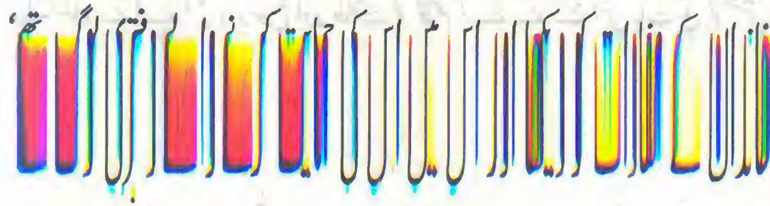
یہ اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ تھا کیونکہ اس میں ایرانیوں اور عربوں کا باہمی ملاپ ہوا۔ مگر چونکہ عربوں کو اپنے سیاسی اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے اور ساتھ ہی میں ان کا سماجی اور ثقافتی تسلط بھی ٹوٹا اس وجہ سے ان میں ایرانی اثرات کے خلاف زبردست جذبات پیدا ہوئے۔

اس لئے اس مرحلہ پر عربوں نے علماء کے ذریعہ اس بات کی کوشش کی کہ ایرانی دفتری اور نوکر شاہی سے نجات حاصل کی جائے جو کہ خلیفہ کے دربار میں مکمل طور پر تسلط حاصل کر چکے تھے۔ اس تصادم نے علماء کے اس طبقہ کو جو اب تک سیاست سے دور مذہبی تعلیمات کے حصول میں مصروف تھا۔ اسے دوبارہ سے سیاسی طور پر باعمل کر

دیا۔ علماء نے اپنے اثر و رسوخ اور طاقت کو قائم کرنے کے لئے اس بات کی کوشش کی کہ خلیفہ کو شریعت کے ماتحت کر دیا جائے کیونکہ ایک مرتبہ جب شریعت کی بالادستی قائم ہو جائے گی۔ تو اس صورت میں اس کی تشریح اور تاویل کرنے کے لئے ان ہی کی ضرورت ہو گی' اور اس طرح خلیفہ اس بات پر مجبور ہو گا کہ تمام معاملات میں ان سے مشورہ کرے۔

دوسری طرف ایران کے دفتری یا نوکر شاہی سے تعلق رکھنے والا گروہ تھا کہ جنہیں عباسی انقلاب کے نتیجہ میں انتظامیہ اور سیاست میں بالادستی حاصل ہو گئی تھی' اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اسے برقرار رکھنے کے لئے قدیم ایرانی سلطنت کے ڈھانچہ کو دوبارہ سے قائم کیا جائے اور ساتھ ہی میں ساسانی دور کی درباری رسومات اور روایات کو واپس لایا جائے کہ جس میں ایک مطلق العنان بادشاہ ایک طاقت ور انتظامیہ کی مدد سے حکومت کرتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ ان کے اس ڈھانچہ میں علماء اور شریعت کی بالا دستی شامل نہیں تھی بلکہ علماء بھی ایران کے زرتشتی مذہب کے موبدوں کی طرح ریاست کے ماتحت تھے' اور بادشاہ کا کہا ہوا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔

بدلتی ہوئی سیاسی صورت حال نے ایران کے دفتری یا نوکر شاہی کے ہاتھوں کو مضبوط کیا کیونکہ جب فتوحات کے ذریعہ عباسی سلطنت میں توسیع ہوئی اور اس میں نئے علاقے اور مختلف مذاہب کے لوگ شامل ہوئے تو اس کے نتیجہ میں بہت سے انتظامی مسائل کے ساتھ نئے سماجی اور ثقافتی مسئلے بھی پیدا ہوئے جن کی وجہ سے اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ خلیفہ اپنے لا محدود اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے انہیں حل کرے' ان کے حل میں خلیفہ نے سب سے پہلے اپنے ذاتی اور



علماء نہیں۔

اسی وجہ سے اس تصادم میں علماء کی یہ کوشش کہ وہ خلیفہ کی سیاسی طاقت کو محدود کرکے اسے شریعت کے ماتحت کر دیں' ناکام ہو گئی اور اس کے برعکس ایران کے دفتری لوگوں نے خلیفہ کو ایران بادشاہت کے ڈھانچہ میں ڈھال دیا اور جن علماء نے ان کے راستہ میں حائل ہونے کی کوشش کی' انہیں سخت سزائیں دی گئیں۔ جن میں سے ایک مثال امام حنبل (وفات ۸۵۵) کی ہے کہ جنھوں نے خلق قرآن کے نظریہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا' اور خلیفہ کی جانب سے دی جانے والی ہر سزا کو برداشت کیا لیکن یہ انفرادی مثالیں ہیں۔ علماء کی اکثریت نے حالات کے تحت خلیفہ کی مطلق العنانیت کو تسلیم کر لیا' اور خود کو اس کی ماتحتی میں دے کر اس کے ہر عمل کو جائز قرار دینے کے لئے فتویٰ دینا شروع کر دیا۔

یہاں پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر علماء کو کیوں اس تصادم میں شکست ہوئی اور کیوں ایرانی نوکر شاہی ان کے مقابلہ میں کامیاب ہوئی اور کیوں شریعت پر سیاسی تقاضے غالب آئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ علماء کے پاس کسی قسم کی سیاسی طاقت نہیں تھی۔ ان کے پاس صرف مذہبی علم تھا کہ جس کی بنیاد پر وہ اپنے مخالفین سے متصادم تھے' جب کہ اس کے مقابلہ میں ایرانی نوکر شاہی کے پاس سیاسی طاقت تھی اور بدلتے ہوئے حالات میں اس بات کی ضرورت تھی کہ خلیفہ زیادہ سے زیادہ طاقت ور ہو۔ اس کے علاوہ جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان کا اس تصادم سے کوئی واسطہ نہیں تھا اور علماء ان کی حمایت حاصل کرنے میں اس لئے ناکام ہو گئے کہ اس وقت سیاسی استحکام کی وجہ سے انہیں امن و امان اور خوش حالی میسر تھی اور اس میں

انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ کون سی جماعت کیا حاصل کرنا چاہتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بدلتے ہوئے حالات میں علماء کے پاس اتنا علم نہیں تھا کہ وہ سماجی' معاشی مسائل کا حل پیش کر سکیں' اور ایسا حل جو معاشرے کے مختلف طبقات کے لئے قابل قبول بھی ہو۔

اس طرح سے علماء کی شکست کے بعد سیاست اور مذہب علیحدہ علیحدہ ہو گئے اور علماء اپنی ناکامی کے بعد دوبارہ سے مذہبی تعلیم کے حصول میں مصروف ہو گئے اور انہوں نے اپنی توجہ اس بات پر مبذول کر دی کہ لوگوں کی روحال زندگی کو کیسے بہتر بنایا جائے؟

اس کے نتیجہ میں اسلامی معاشرے میں دو قسم کے رجحانات پیدا ہوئے۔ اول ریاست کی سرپرستی میں ایسے سیاسی ادارے اور ہمہ گیر ثقافتی روایات پیدا ہوئیں کہ جنھوں نے معاشرہ میں رواداری کو پیدا کیا اور غیر مسلموں کو معاشرہ کا ایک حصہ بنا کر انہیں اس بات کا موقع دیا کہ وہ اس کی تعمیر اور ترقی میں بھرپور حصہ لیں' اس کی ایک مثال عباسیوں کے قائم کردہ دارالحکمت میں ہے کہ جس میں عیسائی اور یہودی علماء شامل تھے کہ جنھوں نے یونانی علوم کے عربی میں ترجمے کئے۔

دوسرا مثبت فائدہ یہ ہوا کہ عربوں نے غیر عرب ثقافت کو اختیار کر کے ذہن کو کشادہ کیا جس کی وجہ سے عباسی دور میں علم و ادب میں زبردست ترقی ہوئی۔

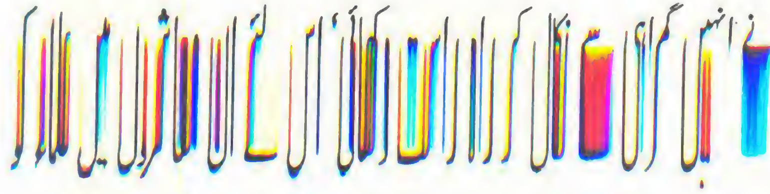
اس کے مقابلہ میں علماء نے معاشرہ میں تنگ نظری کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ہر نئی چیز کی مخالفت کی اور اسلام کی پاکیزگی کو اس میں سمجھا کر اس میں صرف عربی ثقافت باقی رہے اور دوسرے عناصر سے اسے پاک کر دیا جائے۔

اگرچہ علماء کو اس مرحلہ پر شکست ہو گئی مگر دیکھا جائے تو یہ ترقی پسند اور رجعت

علماء کا عروج

اگرچہ تاریخ کے اس پہلے تصادم میں علماء کو ناکامی ہوئی اور وہ سیاسی طور پر اقتدار حاصل کرنے میں ناکام رہے' مگر اس شکست اور ناکامی کے باوجود انہوں نے ہمت نہیں ہاری یہ تو ضرور ہوا کہ انہوں نے سیاست سے کنارہ کشی کر کے دربار کی ملازمت کر لی اکثر نے اپنی توجہ مذہبی تعلیمات کے حصول اور فروغ میں لگا دی اور اس کوشش میں مصروف رہے کہ ان بنیادوں پر وہ معاشرہ میں اعلیٰ اور باعزت مقام حاصل کریں۔

بدلتے ہوئے حالات نے انہیں پھر اس بات کا موقع دیا کہ وہ ایک موثر جماعت کی حیثیت سے ابھریں' انہیں اس بات کا موقع عباسیوں کی نئی فتوحات کی وجہ سے ملا کہ جس کے نتیجہ میں نہ صرف نئے علاقوں پر قبضہ ہوا بلکہ نئے لوگ بھی ان کے ساتھ آئے۔ ان نئے لوگوں میں تبلیغ کا کام مشنری علماء نے کرنا شروع کر دیا اور جو لوگ مسلمان ہوئے ان میں ان علماء کے لئے احترام کے جذبات پیدا ہوئے کہ جنہوں



باعزت مقام مل گیا اور ان میں سے اکثر کو تو اولیاء کا درجہ دے دیا گیا۔

ان نئے معاشروں کے نو مسلموں میں علماء کا اثر و رسوخ اس وجہ سے بھی بڑھا کہ ان کی مادری زبان عربی نہیں تھی۔ اس لئے قرآن' تفسیر' حدیث اور مذہبی تعلیمات کو ان کے لئے سمجھنا مشکل تھا۔ اس لئے انہیں ایسے لوگوں کی ضرورت تھی کہ جو عربی زبان جانتے ہوں اور ان میں یہ اہلیت ہو کہ انہیں مذہبی تعلیمات ان کی زبانوں میں سمجھا سکیں۔ اس کی وجہ سے علماء کی اہمیت بڑھ گئی اور بہت جلد مذہبی تعلیمات اور معلومات پر ان کا قبضہ ہو گیا اور اس نے ایک ایسی جماعت کو پیدا کرنے میں مدد دی جو مذہب اور لوگوں کے درمیان میں ایک واسطہ کا کام دے۔

اس کے ساتھ ہی تبدیل ہوتے ہوئے سیاسی' معاشی اور سماجی حالات کی وجہ سے اسلام میں چار فقہی مذاہب نے مقبولیت حاصل کر لی۔ جن میں حنفی' شافعی' مالکی اور حنبلی ہیں' ان کے اثرات اسلامی دنیا کے مختلف ملکوں میں آہستہ آہستہ پھیلے۔ یہاں تک کہ ہر مسلمان پیدائشی طور پر ان چار میں سے کسی ایک کو ماننے والا ہو گیا۔ چونکہ یہ فقہی مذاہب انتہائی پیچیدہ تھے۔ اس لئے ان پر عبور حاصل کرنا اور پھر ان کی روشنی میں مختلف مسائل پر فتوے دینا ہر آدمی کے بس میں نہیں تھا۔ اس لئے علماء نے ان میں دسترس حاصل کر کے معاشرے کی مذہبی راہنمائی حاصل کر لی۔ اس کی وجہ سے ہر مسلمان اس امر پر مجبور ہوا کہ وہ اپنے مسائل کے لئے علماء سے رائے طلب کرے۔ علماء نے اس مقصد کے لئے دارالافتاء قائم کئے کہ جہاں مشکل اور پیچیدہ مسائل پر فتوے دیئے جاتے تھے۔

اس عمل نے مسلمان معاشرہ میں ریاست اور مذہب کو علیحدہ کر دیا کیونکہ اب

ریاست کا کام یہ تھا کہ وہ ٹیکس وصول کرے۔ لوگوں کو انصاف دے اور ملک میں قانون کی بالادستی قائم کر کے لوگوں کو تحفظ دے۔ جب کہ دوسری جانب علماء کا کام یہ تھا کہ مذہبی تعلیمات کو پھیلائیں اور فقہی مذاہب کی روشنی میں فتوے دے کر لوگوں کی سماجی و ثقافتی اور معاشی الجھنوں کو دور کریں۔

لیکن یہ صورت حال ایک بار پھر تبدیل ہوئی۔ جب عباسی خلافت میں زوال کے آثار شروع ہوئے تو اس کے نتیجہ میں جگہ جگہ خود مختار صوبائی حکومتیں وجود میں آنے لگیں اور نئے حکمران خاندانوں نے سیاسی اقتدار قائم کرنا شروع کر دیا۔ ان نئے حکمراں خاندانوں کو نہ صرف سیاسی طاقت کی ضرورت تھی کہ جو ان کے پاس فوج کی شکل میں موجود تھی' اور اس کے ذریعہ وہ اپنی خود مختاری کو قائم رکھنے میں مصروف تھے' مگر اس کے ساتھ ساتھ انہیں مذہبی سہارے کی بھی ضرورت تھی کہ جو انہیں خلافت سے علیحدگی کا جواز دے اور لوگوں کو مطمئن کرے کہ ان کی آزادی اور خود مختاری کی اصل وجہ مذہب کا تحفظ ہے۔

اس لئے ان نئی صوبائی حکومتوں نے علماء کو ریاست کے ڈھانچہ میں ضم کر لیا اور ان کے لئے خاص مذہبی و عدالتی عہدے مقرر کئے گئے' جن میں قاضی' مفتی اور صدر شامل تھے۔ اس کے علاوہ انہیں ٹیکس جمع کرنے' سزائیں دینے اور ملک میں امن و امان قائم کرنے کے فرائض بھی سونپے گئے۔ انتظامیہ میں شمولیت کے بعد علماء کا طبقہ مذہبی جماعت سے نکل کر سیاسی اور سماجی طبقہ اعلیٰ میں شامل ہو گیا۔ جس کی وجہ سے ان کی حیثیت تبدیل ہو گئی اور انہوں نے دولت مند تاجروں' امراء' اور دربار کے اعلیٰ عہدے داروں کے خاندانوں میں شادی بیاہ کر کے خود کو اس میں شامل کر لیا۔ چنانچہ اس عہد میں' یعنی گیارہویں و بارہویں صدیوں میں ایسی بہت سی مثالیں


ملتی ہیں کہ جس میں علماء شہروں اور صوبوں کے گورنر اور اعلیٰ عہدے دار نظر آتے

ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ مذہبی امور کے ساتھ ساتھ انہوں نے سیاسی اقتدار بھی حاصل کر لیا تھا اور حکومت کا ایک حصہ بن گئے تھے۔

اگرچہ یہ ضرور ہوا کہ ریاست میں شمولیت کی وجہ سے علماء کے کردار پر زبردست اثر پڑا کیونکہ اب انہوں نے حکومت و حکمران کے مفادات کا تحفظ شروع کر دیا اور خود کو لوگوں سے علیحدہ کر کے ان کے ساتھ رعیت والا سلوک شروع کر دیا۔

ان کا یہ کردار اس دور کی تاریخ میں واضح طور پر موجود ہے کیونکہ انہوں نے اپنی مذہبی حیثیت کو حکمران کے مفاد کے لئے استعمال کیا اور دربار میں جو سیاسی عمل جاری تھا اس کی مخالفت کرنے کے بجائے اس کی حمایت کی' مثلاً ان میں سے اکثر شاہی خاندانوں نے لوگوں میں اپنی حیثیت کو تسلیم کرانے کے لئے اس بات کے دعوے کئے کہ ان کا تعلق قدیم ایرانی شاہی خاندانوں سے ہے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے دربار میں قدیم ایرانی رسومات کو رواج دیا اور قدیم ایرانی تہوار جن میں نو روز کا تہوار قابل ذکر ہے اسے بڑی شان و شوکت سے منانا شروع کر دیا۔ ان کے درباروں میں شراب اور عیش و عشرت کی محفلیں' ناچ و گانا و رقص عام تھے' مگر علماء نے اس پورے عمل کو خاموشی سے دیکھا اور ضرورت پڑی تو اس کے حق میں ہی فیصلہ دیا اور اپنے سماجی و سیاسی مرتبہ کو برقرار رکھنے کے لئے اس نظام کی حمایت کی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ ان کا سماجی مرتبہ تو بڑھ گیا۔ مگر دولت و سیاسی اقتدار نے لوگوں میں ان کی عزت کو کم کر دیا اور اس کے بعد سے ادب' شاعری اور لطیفوں و قصوں و کہانیوں میں ان کا ذکر استہزا مذاق کے طور پر آنے لگا۔

علماء اور مدرسہ

مدرسہ کے قیام سے پہلے' مذہبی تعلیم یا تو استاد کے گھر پر دی جاتی تھی اور یا پھر مسجد میں' کہ جہاں بیک وقت کئی استاد اپنے حلقے بنا کر طالب علموں کو پڑھایا کرتے تھے۔ یہ تعلیم عام طور پر نجی ہوتی تھی اور ریاست بہت کم ان کی مالی امداد کیا کرتی تھی۔ اگر کوئی علماء' استادوں' اور مذہبی تعلیم کے لئے چندہ دے اور ان کی مالی اعانت کرے تو اسے نیک کام سمجھا جاتا تھا۔ اس وجہ سے اکثر جلد ہی تعلیم کا خرچہ گاہے بگاہے مخیر حضرات کی مدد سے چلا کرتا تھا۔ جن میں تاجر امراء' اور حکومت کے اعلیٰ عہدے دار شامل ہوا کرتے تھے۔

جب عباسی خلافت کی کمزوری کی وجہ سے' خلافت کے صوبوں میں آزاد حکومتیں قائم ہونا شروع ہوئیں تو ان کو ایسے تربیت یافتہ علماء کی ضرورت تھی کہ جو قاضی' مفتی' اور صدر کے عہدوں کے لئے مناسب ہوں۔ چنانچہ اس ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے مدرسہ کی ضرورت پڑی تاکہ ایک ایسا ادارہ ہو کہ جہاں باقاعدہ تعلیم و

تربیت کے بعد علماء کو تیار کیا جا سکے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلا مدرسہ خراساں میں قائم ہوا'

اور اس کے بعد اس کی تقلید کرتے ہوئے اسلامی دنیا کے مختلف حصوں میں مدرسے قائم ہونا شروع ہو گئے۔

چونکہ ایک مدرسہ کے لئے ضروری تھا کہ اس کی ایک عمارت ہونی چاہیے کہ جس میں استادوں و طالب علموں کے لئے کتب خانہ ہو' اس میں باقاعدہ تنخواہ دار اساتذہ ملازم ہوں اور طالب علموں کی رہائش کے لئے ہاسٹل ہو' اس لئے ایک ایسا ادارہ چندوں کے سہارے نہیں چل سکتا تھا۔ اس کے لئے باقاعدہ آمدنی کی ضرورت تھی۔ اس لئے ان مدرسوں کو ریاست نے مالی امداد فراہم کی اور اس طرح ریاست نے نہ صرف مدرسوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا بلکہ مذہبی تعلیم کو بھی اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا۔

ان مدرسوں کا پہلا مقصد تو یہ تھا کہ ایسے لوگوں کی تربیت کی جائے جو شریعت و فقہی امور میں مہارت رکھتے ہوں تاکہ یہ لوگ عدالتی عہدوں پر مقرر کئے جائیں۔ اس لئے بہت جلد ایسے مدرسے قائم ہونا شروع ہو گئے کہ جو چار سنی فقہی مذاہب میں طالب علموں کو تعلیم دیتے تھے اس کی وجہ سے مدرسہ ایک ایسا مرکز ہو گیا کہ جو معاشرے کی مذہبی ضروریات کو پورا کرتا تھا' اور مذہبی اقدار کا تحفظ کرتا تھا۔

سنی عالم اسلام کے مقابلہ میں' مصر میں فاطمی خلافت (۹۰۹ سے ۱۱۷۱) نے مشہور الازھر کی بنیاد ڈالی جو کہ اگرچہ مسجد کا نام تھا مگر یہ ایک مدرسہ تھا کہ جس کا مقصد یہ تھا کہ یہاں ایسے مشنری علماء کی تربیت کی جائے کہ جو سنی عقائد کے خلاف تبلیغ کر کے لوگوں کو شیعی عقائد کی طرف مائل کر سکیں۔ فاطمی ریاست نے الازھر کی مکمل طور پر سرپرستی کی اور اس میں مشہور علماء کو بحیثیت استاد کے مقرر کیا اور ان کی اچھی

تنخواہیں مقرر کیں تاکہ وہ اطمینان کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول رہ سکیں۔ تقریباً دو سو سال تک الازھر شیعی عقائد کی تعلیم کے لئے مشہور رہا کہ جس کے تربیت یافتہ مبلغ علماء پوری اسلامی دنیا میں پھیل گئے اور بڑے موثر انداز میں انہوں نے اپنے عقائد کی تبلیغ کی۔ ان مشنری علماء کی سرگرمیاں اس قدر خفیہ اور اس قدر اثر کرنے والی تھیں کہ اس سے سنی معاشرے پریشان ہو گئے' اور انہیں ان سے زبردست خطرے کا احساس ہوا۔

لہٰذا اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے سلجوق خاندان کے مشہور وزیر نظام الملک (وفات۔ ۱۰۹۲) نے مدرسوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جو اس کے نام سے مدرسہ نظامیہ مشہور ہوا۔ یہ مدرسے بغداد' نیشاپور' ہرات' اصفہان 'اور موصل میں قائم ہوئے۔ بغداد کے مدرسہ کے پرنسپل مشہور مذہبی عالم غزالی (وفات - ۱۱۱۱) تھے ان مدرسوں کی مذہبی تعلیم میں حنفی و شافعی' فقہی مسالک پر زور دیا جاتا تھا' اور ساتھ میں انہیں اس مقصد کے لئے تربیت دی جاتی تھی کہ وہ شیعہ' اسماعیلی' اور قرامطی تحریکوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ان کے عقائد کو رد کریں۔

اس مذہبی تصادم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں جانب سے علماء کو انتہائی اہمیت مل گئی اور انہیں سنی و شیعہ حکومتوں کی جانب سے نہ صرف مالی امداد ملنے لگی بلکہ ان کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔ اس کی وجہ سے معاشرے میں ان کا سماجی رتبہ بڑھ گیا اور ان کو بھی یہ احساس ہو گیا کہ ان کا تعلق اس گروہ سے ہے کہ جو صراط مستقیم پر ہیں۔ اس لئے یہ ان کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کی راہنمائی کریں اور حکمرانوں کے اعمال کی بھی جانچ پڑتال کریں تاکہ وہ مذہب سے روگردانی نہیں کر سکیں۔

لیکن مدرسہ کے دو نتائج نکلے ایک طرف تو اس نے علماء کو منظم کیا۔ انہیں



اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کہ ان مدرسوں نے ایک بڑی تعداد میں فارغ التحصیل طالب علموں کو پیدا کرنا شروع کر دیا، جس کی وجہ سے ریاست میں جتنی مانگ تھی۔ یہ اس سے زیادہ بڑھ گئے اور جب انہیں کوئی کام کرنے کو نہیں رہا، تو غربت و بے روزگاری کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہوں نے مذہبی مسائل اور تنازعے پیدا کرنا شروع کر دیئے اور فرقہ واریت کو خوب ہوا دی۔ چونکہ انہیں ریاست میں عہدے نہیں ملے۔ اس لئے انہوں نے حکومت کی بھی مخالفت شروع کر دی اور ساتھ ہی میں ان علماء کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا کہ جو ریاستی عہدے دار تھے۔ ان کی نظر میں یہ علماء مذہب کا کاروبار کر رہے تھے، اور دینی احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان سے روگردانی میں مصروف تھے۔

اس لئے انہوں نے ان علماء کو علماء سو کہا اور خود کے لئے علماء حق کا لقب اختیار کیا۔ مگر اس سارے مسئلہ نے ایک نئی صورت حال اختیار کر لی کیونکہ علما سو اور علماء حق میں کبھی بھی متفقہ فیصلہ نہیں ہو سکا اور ہر گروہ ایک دوسرے کو اس سے مخاطب کرتے رہے۔

اپنے مقدمہ کو مضبوط کرنے کی غرض سے علماء نے لوگوں کی طرف توجہ دی اور مذہبی معاملات پر ان کے جذبات کو ابھارنا شروع کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں فرقہ واریت کی بنیادیں پڑ گئیں اور مذہبی بنیادوں پر ایک دوسرے سے نفرت کی ابتداء ہو گئی۔

شریعت اور ایرانی نظریہ بادشاہت

ایک مسلمان حکمران کی کیا خصوصیات ہونی چاہیں؟ اس مسئلہ پر عباسی خلافت کے قائم ہونے کے فوراً بعد ایرانی دفتری لوگوں اور علماء میں سیاسی اقتدار کے لئے پہلا تصادم ہوا تھا' علماء کا موقف تھا کہ مسلمان حکمران کے لئے ضروری ہے کہ وہ شریعت کے احکامات کی پیروی کرے اور اس کی بالا دستی قائم کرتے ہوئے اپنے ذاتی مفادات اور سیاسی معاملات کو اس کے ماتحت کر دے۔

اس کے مقابلہ میں ایران کے دفتری یا عہدے دار ایران کے قدیم نظریہ بادشاہت کا احیاء چاہتے تھے کہ جس میں بالادستی حکمران کو تھی اور شریعت کو اس کے مفادات اور مرضی کے مطابق بدلتے رہنا چاہیے تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک اچھے حکمران کا جو تصور قدیم ایران میں تھا' اس کا دوبارہ سے احیاء کیا اور وہ بہت سارا ادب عربی زبان میں منتقل کر دیا کہ جس میں بادشاہ عادل کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ۸ ویں اور ۹ ویں صدیوں میں جو کتابیں دربار کے آداب پر لکھی گئیں۔ ان



کی روشنی میں عباسی خلفاء نے اپنے دربار میں قدیم ایرانی رسومات کو قائم کیا اور اس کے ساتھ ہی ریاستی اداروں کو اس طرح سے تشکیل دیا کہ وہ حکمران کی مرضی و خواہش کے تابع رہیں۔

عباسی حکومت کی کمزوری اور نئی حکومتوں کے قیام کے بعد علماء اور ایرانی دفتری لوگوں میں ایک بار پھر یہ تصادم ہوا کہ مسلمان حکمران کو کیسا ہونا چاہیے؟ کیا اسے شریعت کے ماتحت ہونا چاہیے یا خود مختار اور مطلق العنان؟ اس مقصد کے تحت دونوں گروہوں نے ایک ایسا ادب تخلیق کیا کہ جس میں انہوں نے حکمران کو ہدایت کی کہ اس کے لئے کون سا راستہ مناسب ہے۔ چنانچہ علماء کی جانب سے نمائندہ تحریر الماوردی (وفات ۱۰۵۸) کی ہے کہ جس نے اپنی کتاب "الاحکام السلطانیہ" میں ایک ایسی حکومت کا نقشہ پیش کیا ہے کہ جس میں حکمران شریعت کے اندر رہتے ہوئے اپنے فرائض ادا کرے اور شریعت کے نفاذ میں علماء سے ہدایات لیتا رہے' خلیفہ یا حکمران کے فرائض بیان کرتے ہوئے الماوردی ان باتوں پر زور دیتا ہے۔

۱۔ دین کی حفاظت کرے اور اگر کسی شخص نے کوئی بدعت کی ہو' یا دین کے سلسلہ میں شک کا اظہار کیا ہو' تو اس صورت میں یہ خلیفہ کا کام ہے کہ اسے دلائل دے کز قائل کرے اس کے شک کو دور کرے۔ اور حق بات کو اس ذہن میں بٹھائے اور کوشش کرے کہ دین کے احکامات نافذ ہوں اور ان میں کوئی خلل واقع نہ ہو اور مسلمان امت برائیوں دلغزشوں سے محفوظ رہے۔

۲۔ اگر دو گروہوں میں جھگڑا ہو تو اسے شریعت کے احکامات کے تحت حل کرے تاکہ انصاف قائم ہو۔

۳۔ شریعت کو نافذ کرے تاکہ جن باتوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ ان کا

ارتکاب کوئی شخص نہ کرے' اور لوگوں کے حقوق غصب نہ ہوں۔

۴۔ پہلے اسلام کی دعوت دے' نہ ماننے پر مخالفین اسلام پر جہاد کرے۔ خدا کی جانب سے خلیفہ پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کو دوسرے تمام مذاہب پر حاوی کر دے۔

۵۔ خوف اور جبر کے بغیر شریعت کے مطابق ٹیکس وصول کرے۔

۶۔ بیت المال سے مستحقین کے لئے وظیفے اور تنخواہیں مقرر کر دے اور دیکھے کہ یہ تنخواہیں انہیں پابندی سے ملا کریں۔

۷۔ دیانت داروں کو اپنا قائم مقام اور قابل اعتماد لوگوں کو حاکم و عامل مقرر کرے' اور خزانہ کو ایسے ہی لوگوں کے سپرد کرے (الاحکام السلطانیہ (اردو ترجمہ) کراچی۔ ۱۹۶۵ء ص - ۳۲- ۳۴)

غزالی (وفات ۱۱۱۱) نے اپنی کتاب "نصیحت الملکوک" میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ خلافت اور سلطنت کو ملا دیا جائے تاکہ یہ ادارہ مذہب کی حفاظت کر سکے۔ اس میں غزالی کے نزدیک بہترین حکمران وہ ہے کہ جو مذہب کی حفاظت کرتا ہے۔ احکام دین کا نفاذ کرتا ہے۔ مذہبی و پرہیزگار لوگوں کا خیال کرتا ہے اور انکساری کے ساتھ پیش آتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں ایرانی نقطہ نظر سے سلجوق وزیر نظام الملک نے سیاست نامہ اور کے کاؤس (وفات ۱۰۸۲) نے قابوس نامہ لکھا۔ سیاست نامہ میں بادشاہ کے جن فرائض کا ذکر کیا ہے اور اس میں جن اوصاف پر زور دیا گیا ہے وہ ایران کے قدیم نظریہ بادشاہت کے مطابق ہیں۔ مثلاً اس میں بادشاہ کے لئے عادل اور انصاف پسند ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ معاشرہ کی طبقاتی تقسیم

کو برقرار رکھتے ہوئے ان میں توازن قائم رکھے۔ خصوصیت سے یہ بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ قدیم امراء کی مراعات کا خیال رکھے اور ان کے مرتبہ کو قائم رکھے۔ نظام الملک عدل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ 'اللہ کی مرضی و خوشنودی عدل اور انصاف میں ہے۔ جب بھی رعایا اور مخلوق سے نیک سلوک کیا جائے گا اور ان پر ظلم و ستم نہیں ہو گا تو مخلوق ہمیشہ بادشاہ کے لئے دعائے خیر کرے گی۔ "کفر کے باوجود ملک باقی رہ سکتا ہے' لیکن اگر ملک میں ظلم و ستم بڑھ جائے تو اس کی وجہ سے ملک کی بقا کو خطرہ ہوتا ہے"۔

نظام الملک سیاست نامہ میں مے نوشی کے آداب بھی بتاتا ہے اور لکھتا ہے مخصوص مے نوشی کی محفلوں کے ساتھ ساتھ ایسی محفلیں بھی ہوں کہ جن میں عام لوگ جو کہ شراب کے عادی ہیں وہ شریک ہوں۔ البتہ جو دن مخصوص لوگوں کے لئے ہوں ان میں صرف چیدہ چیدہ شریک ہوں۔ (سیاست نامہ۔ اردو ترجمہ' کراچی۔ ص۔ ۱۶۔۱۷۔ ۱۳۱۔۱۴۱)

سیاست نامہ میں ایک خود مختار اور مطلق العنان حکمراں کا تصور ہے کہ جو شریعت سے بالاتر ہے اور علماء اس کے ماتحت ہیں۔

قابوس نامہ میں ایک نوجوان شہزادہ کی تربیت کے لئے ہدایات ہیں کہ ایک اچھے فرماں روا کے لئے کیا خصوصیات ہونی چاہئیں' اس میں بھی ایرانی تصورات کو پیش کیا گیا ہے اور بادشاہ کو مکمل اختیارات دیئے گئے ہیں۔

مذہبی اور سیکولر ادب میں' دونوں میں اس بات کو تسلیم کر لیا گیا ہے ایک حکمران کی شخصیت انتہائی اہم ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے معاشرہ کی زندگی بدل جاتی ہے اس کو تسلیم کرتے ہوئے دونوں جانب سے اس بات کی کوشش کی گئی کہ حکمران کو

اپنے اپنے نظریات کے تحت ڈھال لیا جائے۔ مذہبی ادب میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ بادشاہ کو شریعتی احکامات کے نفاذ اور ان کو قائم کرنے کے لئے علماء کی ضرورت ہے۔ اس لئے انہیں ریاست میں شریک کیا جائے اور ان کے مشوروں کو مانا جائے تاکہ اسلام کو فروغ ہو۔ کیونکہ امت کی بھلائی اسی میں ہے۔

اس کے برعکس ایرانی دانشوروں اور سیاستدانوں نے جو ادب تخلیق کیا اس میں بادشاہ مطلق العنان ہے اور اس کے لئے لازمی ہے کہ ملک میں عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے وہ امراء اور دانشمندوں سے مشورہ کرے اور انہیں سلطنت کے معاملات سپرد کر دے۔

اس تصادم میں بھی علماء کو ناکامی ہوئی اور وہ حکمرانوں کو شریعت کے ماتحت نہیں کر سکے کیونکہ ان حکمرانوں کا مفاد اس میں تھا کہ وہ اپنے اپنے خاندان کے استحکام کے لئے ایرانی روایات کو اختیار کریں اور ان سیکولر اداروں کی سرپرستی کریں کہ جو ان کی سلطنت کے استحکام کے لئے ضروری ہیں کیونکہ شریعت ان کی حکمرانی میں حائل ہوتی تھی اس لئے انہوں نے خاموشی سے اسے نظر انداز کر دیا۔ مثلاً شریعت کے تحت مذہبی اقلیتوں کو ذمی تصور کیا جانا چاہیے' اور انہیں اعلیٰ و کلیدی عہدوں پر مقرر نہیں کرنا چاہیے۔ مگر یہ حکمران اس بات پر مجبور تھے کہ سلطنت کے انتظام کے لئے عیسائیوں اور یہودیوں کا اعلیٰ عہدوں پر تقرر کریں اور ان پر اعتماد کرتے ہوئے' حکومت کی ذمہ داریاں ان کے سپرد کریں۔ اس لئے جہاں اس قسم کی مجبوریاں پیش آئیں وہاں حکمرانون نے شریعت کے بجائے حکومت کے مفاد کو اپنے پیش نظر رکھا۔

بنیاد پرستی اور اصلاحی تحریکیں

فتوحات کی وجہ سے جب اسلامی دنیا پھیلی اور اس میں نئی نئی قومیں شامل ہوئیں تو وہ اپنے ساتھ اپنی سماجی اور ثقافتی روایات' رسومات اور تہواروں کو بھی ساتھ میں لائیں۔ اس لئے فتوحات کے ساتھ اور تبلیغ کی سرگرمیوں کے نتیجہ میں اسلام جن جن علاقوں اور ملکوں میں پہنچا وہاں اس نے علاقائی ثقافتی ماحول میں خود کو ضم کر لیا۔ اس کی وجہ سے اسلام میں عربی ثقافت کا تسلط ٹوٹ گیا۔

عربی ثقافت کے خلاف سب سے زیادہ رد عمل ایرانیوں کا تھا کہ جنھوں نے فوجی و سیاسی طور پر مفتوح ہونے کے باوجود اپنی سماجی اور ثقافتی روایات و اقدار کو باقی رکھا تھا بلکہ عباسی دور میں ان کا تسلط اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ جب ایرانی خاندانوں کو دوبارہ سے حکومت ملی تو انھوں نے ایرانی روایات کو زندہ کرنے اور ان کی سرپرستی میں خوب جوش کا مظاہرہ کیا۔

عباسی عہد میں ایرانیوں نے جو شعوبیہ یا اقوام پرستی کی تحریک شروع کی' وہ

تحریک کمزور ہونے کے بجائے مضبوط ہوتی رہی اور عربی ثقافت کے مقابلہ میں ایرانی ثقافت کا غلبہ برابر بڑھتا ہی رہا۔

دوسری طرف جب حکمراں طبقہ کے پاس مال و دولت آئی تو اس نے عربی قبائلی روایات کو چھوڑ کر شان و شوکت اور عیش و عشرت کو اختیار کر لیا اور معاشرہ میں مذہبی شعار کا رواج کم ہوتا چلا گیا۔

ان حالات میں سب سے پہلے امام حنبل نے کہ جو سینوں کے چار فقہی مذاہب میں سے ایک کے بانی ہیں اور جنہوں نے احادیث کا مجموعہ مسند کے نام سے لکھا ہے اس بات پر زور دیا کہ اسلام کا اس ثقافتی یلغار سے دفاع کیا جائے' اور اس میں جو بدعتیں داخل ہو گئی ہیں' ان سے اسے پاک کیا جائے اور ان کے نزدیک اس آلودگی کو پاک کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ اسلام کی بنیادی تعلیم کا احیاء ہو اور اسلام کی تعبیر و تفسیر میں جو فلسفیانہ موشگافیاں کی گئیں ہیں انہیں رد کیا جائے۔

چنانچہ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ قرآن کو اس کے لفظی معنوں میں سمجھا جائے اور اس کی تشریح میں تاویل یا تمثیل کو استعمال نہیں کیا جائے۔ دوسرا بڑا ذریعہ پیغمبر خدا کی احادیث ہیں' اس لئے وہ تمام احادیث کہ جن پر یقین ہو کہ یہ پیغمبر خدا کی ہیں۔ ان پر عمل کیا جائے۔ انہوں نے مسند میں ایسی ہی احادیث کو جمع کر دیا ہے۔

اس لئے انہوں نے مفتیوں سے کہ جو لوگوں کے مسائل کے حل کے لئے فتوے دیتے ہیں اس بات پر زور دیا کہ وہ فتوے دیتے ہوئے قران و حدیث کے بعد گزرے ہوئے بزرگوں کی پیروی کریں' ذاتی رائے سے دور رہیں' فقہی مسلک کو بغیر کسی ترمیم کے اختیار کیں اور اجتہاد سے پرہیز کریں۔

امام حنبل کا سب سے بڑا مسئلہ بدعت کا تھا۔ کیونکہ بہت سی ایسی رسومات اور

روایات اسلامی معاشرے میں آ گئیں تھیں کہ جو عرب معاشرہ میں نہیں تھیں' اس لئے انہوں نے ہر نئی چیز کی مخالفت کی اور یہ استدلال دیا کہ ہر بدعت' یا نئی چیز اسلام کو مسخ کرتی اور بگاڑتی ہے۔ اس لئے اسلام میں بدعتوں کو روکا جائے اور اس کی قدیم ساخت کو برقرار رکھا جائے۔

اس طرح سے وہ اسلامی معاشرہ میں عربی ثقافت اور عربوں کی برتری چاہتے تھے کیونکہ عباسی دور میں' ایرانیوں نے عربوں کی طاقت اور ان کے اقتدار کو ختم کر دیا تھا۔ اس لئے وہ حکومت اور خلافت صرف قریش کا حق سمجھتے تھے۔ تاکہ کوئی غیر عرب خلافت و حکومت پر قابض نہیں ہو سکے۔ اس لئے وہ امت کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ عربوں کے حقوق کا پاس کرنا چاہیے ان کے درجات کو تسلیم کرنا چاہیے۔ گذشتہ دور میں انہوں نے جو خدمات کی ہیں ان کا اعتراف کرنا چاہیے اور عربوں سے کسی قسم کی نفرت اور کینہ نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ اس صورت میں یہ ممکن ہو جائے گا کہ قدیم شہنشاہیوں کو دوبارہ سے زندہ کر کے غیر عربی تہذیبوں کو فروغ دیا جانے لگا۔

اس طرح امام حنبل نے بنیاد پرستی کی تحریک شروع کی کہ جس میں دوسری ثقافتوں اور تہذیبی روایتوں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس لئے ان کے ماننے والے اپنے نظریات میں انتہائی تنگ نظر اور متشدد تھے اور قوت و طاقت کے ذریعہ اپنے نظریات کو نافذ کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ۹۲۹ء اور ۹۳۵ء میں حنبلیوں مذہبی فسادات میں حصہ لیا کہ جس میں ہزاروں آدمی مارے گئے۔ ۹۳۵ء میں انہوں نے بغداد میں مسلح بغاوت کر دی اور شراب کی دکانوں کو لوٹا اور جلا دیا ان کی اس تحریک کے پس منظر میں عربوں کے سیاسی اور ثقافتی اقتدار کے خلاف نفرت اور غم و غصہ تھا اور یہ اسلام کو صرف عربی ثقافت کے دائرہ میں رکھنا چاہتے تھے۔ مگر ان کی تحریک



اسے نہیں روک سکے۔

بنیاد پرستی کا یہ بہاؤ اس وقت اور بھی رک گیا جب سیاسی حالات تیزی سے بدلنا شروع ہوئے' منگولوں کے حملوں نے پوری اسلامی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا' عباسی خلافت کا خاتمہ ہوا اور ایک طرح سے اسلامی دنیا کی مرکزیت ختم ہو گئی۔ اس وقت جو سیاسی بے چینی اور سماجی انتشار تھا۔ اس میں امام ابن تیمیہ (وفات۔ ۱۳۲۸) نے امام حنبل کی تقلید کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کی طرف واپس جانا چاہیے اور اب تک جو بدعتیں اسلام میں داخل ہو گئی ہیں۔ انہیں ختم کرنا چاہیے۔

اس لئے انہوں نے بھی قرآن و حدیث کی لفظی تفسیر پر زور دیا اور اسلام میں جو خارجی' شیعہ' معتزلی' اشعری' اور دوسرے فرقوں کے خیالات آ گئے تھے ان پر سخت اعتراضات کئے۔ خاص طور سے انہوں نے فلسفہ یونان اور اس کے حامیوں پر تنقید کرتے ہوئے اس بات کو کہا کہ فلسفہ کفر کی جانب لے جاتا ہے اس لئے اس کے مطالعہ سے پرہیز کیا جائے۔

وہ شعر و شاعری کے بھی زبردست مخالف تھے اور اسے گمراہی کا ایک سبب گردانتے تھے وہ ان تمام رسومات کے خلاف تھے کہ جن سے اسلام کی وحدانیت پر حرف آتا تھا۔ ان میں اولیاء پرستی اور مزاروں کی زیارت خاص طور سے قابل ذکر ہیں کہ جن کا رواج اس وقت بہت ہو گیا تھا۔ وہ ان تمام فرقوں اور افراد کے خلاف سخت زبان استعمال کرتے ہیں کہ جو ان کے نزدیک دین کے دشمن ہیں' ان میں خاص طور سے عیسائی اور یہودی شامل ہیں۔

امام تیمیہ کے ہاں بھی خیالات میں شدت ہے اور وہ سختی سے اپنے موقف کو منوانا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں وہ علماء کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک علماء پیغمبر خدا اور خلفاء راشدین کی وراثت کے نگہبان ہیں۔ اس لئے یہ ان کا فرض ہے کہ وہ امت کی ہدایت کرتے ہوئے اس سے شریعت کے احکامات کی تعمیل کرائیں۔ اس لئے وہ علماء پر زور دیتے ہیں کہ وہ حکمرانوں کو نصیحت کریں اور حکومت کو یہ بتاتے ہیں کہ صحیح حکومت وہی ہے کہ جو علماء کے مشورے پر چلتی ہے اس لئے ان کے نظریہ کے تحت حکمران سے زیادہ اہم ذمہ داری علماء کی ہوتی ہے کہ وہ ایسے قوانین بنوانے میں مدد دیں کہ جو شریعت کے مطابق ہوں اور اسلامی معاشرے میں جو اخلاقی برائیاں پھیل گئی ہیں انہیں دور کیا جا سکے۔

لیکن امام [illegible] اور ابن تیمیہ دونوں کی تحریک ایک گروہ تک محدود رہی اور یہ زیادہ مقبولیت اس لئے حاصل نہیں کر سکی کہ ان میں قوت برداشت نہیں تھی اور نہ روا داری' یہ تشدد اور سختی سے اپنی بات تسلیم کرانا چاہتے تھے اور ان رجحانات کے خلاف تھے کہ جو معاشرہ کو آگے لے جا رہے تھے۔ اس لئے انہیں ناکامی کا سامنا ہوا مگر انہوں نے ان نظریات کو ضرور باقی رکھا کہ جن پر آگے چل کر بنیاد پرستی کی تحریکوں کا آغاز ہوا۔ خاص طور سے حجاز میں عبدالوہاب کی تحریک انہیں کے خیالات سے متاثر ہو کر ابھری۔

علماء صفوی اور عثمانی دور حکومت میں

عثمانی سلطنت جسے عثمان نے (۱۲۸۱ سے ۱۳۲۴) قائم کیا اور جس کی شان و شوکت سلیمان قانونی (۱۵۲۰ سے ۱۵۵٦) تک مستحکم ہو گئی۔ اس سلطنت کے ڈھانچہ میں علماء کا ایک متعین کردار مقرر کیا گیا۔ اسی طرح سے جب ایران میں شاہ اسماعیل (۱۵۰۱ سے ۱۵۲۴) نے صفوی سلطنت کی بنیاد ڈالی تو اس کے تبدیل ہوتے ہوئے ڈھانچہ میں علماء ریاست سے علیحدہ ہو کر ایک خود مختار جماعت کی حیثیت سے ابھرے۔ ان دونوں سلطنتوں میں علماء نے جو کردار ادا کیا اس میں سنی اور شیعی عقائد کا بھی بڑا دخل تھا۔

مثلاً جب شاہ اسماعیل نے ایران میں اپنی سلطنت کے قیام کے بعد شیعہ مذہب کو سرکاری مذہب قرار دیا تو اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ایران کی اکثریتی سنی آبادی کو کس طرح سے شیعہ بنایا جائے۔ اس مقصد کے لئے اس نے اسلامی دنیا سے شیعہ علماء کو بلایا تاکہ وہ شیعہ مذہب کو فروغ دے کر اس کی سلطنت کو مضبوط کریں۔ ان کے اس مشن میں ریاست کی پوری حمایت اور تعاون ان کے کے

ساتھ تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے شیعہ مذہب کی تعلیمات کے لئے ۱۰۳۴ء میں علی

الکرکی نے پہلا شیعہ مدرسہ قائم کیا۔ تاکہ شیعہ مذہب اور فقہ کے تحت علماء کو تیار کیا جائے۔

صفویوں نے علماء کی مدد سے نہ صرف یہ کہ ایران کو شیعہ بنایا بلکہ انہوں نے انہیں سلطنت میں شامل کر کے کوشش کی کہ مذہب کو سیاست کے لئے استعمال کیا جائے۔ صفوی سلطنت کے اعلیٰ عہدے داروں میں صدر کا عہدہ تھا کہ جس پر کسی عالم کا تقرر کیا جاتا تھا اور یہ مذہبی امور کی دیکھ بھال کرتا تھا اور یہ اس کی ذمہ داری تھی وقف کی آمدنی کو مذہبی کاموں پر خرچ کرے اور علماء کو ان کی مال ضروریات کے لئے زمین الاٹ کرے۔ اس قسم کی زمین کے لئے سیورغال کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی۔ یہ زمین الاٹ کرے۔ یہ زمین علماء کو موروثی طور پر ملتی تھی اور اس پر ان سے کسی قسم کا ٹیکس بھی نہیں لیا جاتا تھا۔ اس طرح علماء خاندانوں کا ایک مراعات یافتہ طبقہ وجود میں آگیا کہ جنہوں نے مذہبی علم کو نہ صرف یہ کہ اپنے طبقہ میں محدود کر لیا' بلکہ اپنی مراعات کے تحفظ کے لئے انہوں نے ریاست سے زیادہ سے زیادہ تعاون کیا اور اپنی سماجی حیثیت کو اور مضبوط بنانے کے لئے ان کے سماجی روابط امراء اور جاگیرداروں سے ہو گئے۔

اس کے علاوہ عدالتی عہدوں پر بھی علماء کا تقرر ہوتا تھا اس طرح سے ریاست کی انتظامیہ میں شمولیت سے یہ سلطنت کے اہم رکن بن گئے تھے۔

لیکن جب سترہویں صدی میں ایرانی ریاست کمزور ہوئی' تو اس کے ساتھ ہی اس کی گرفت علماء پر بھی کمزور پڑ گئی اور علماء نے اس مرحلہ پر خود کو ریاست سے علیحدہ کر کے سیاست اور مذہب کو جدا کر دیا۔ اس کی ابتدا اس طرح سے ہوئی کہ سب

سے پہلے شیعہ علماء نے صفوی حکمران کو امام ماننے سے انکار کر دیا- کیونکہ اثنا عشری عقیدے تحت بارہویں امام روپوش ہو گئے ہیں' اور وہ ایک خاص وقت پر ظاہر ہوں گے- لہٰذا ان کے عقیدہ کے مطابق امام کی غیر موجودگی میں ان کی نمائندگی علماء کریں گے' اس لئے ایران میں مجتہدین کی اہمیت بڑھ گئی اور وہ مذہبی معاملات میں آخری لفظ بن گئے-

تاریخ کے اس عمل میں ایران میں علماء کے دو گروہ پیدا ہوئے ایک اصولی اور دوسرا اخباری- اصولی اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں حالات کو دیکھتے ہوئے اجتہاد کیا جا سکتا ہے' جب کے اخباری علماء کے نزدیک فقہ کو صرف احادیث پر رہنا چاہیے اور اسے اصول' رائے' یا دلیل کی بنیاد پر نہیں ہونا چاہیے' لیکن بعد میں اخباری علماء کمزور ہو گئے کیونکہ بدلتے ہوئے حالات میں ضروری تھا کہ اجتہاد کیا جائے-

انیسویں صدی کے آتے آتے علماء ریاست و حکمراں کے مخالف ہو گئے اور انہوں نے آزادانہ اور خود مختار حیثیت اختیار کرتے ہوئے اپنا سلسلہ علیحدہ سے قائم کیا- انہوں نے جو مذہبی مدرسے قائم کئے اس کے اخراجات انہیں بازاری لوگوں' امراء' اور دولت مندوں سے ملنے لگے جو مذہب کی خدمت کو ثواب اور بخشش کا باعث سمجھتے تھے'' اس وجہ سے ایرانی معاشرہ میں مجتہد کی حیثیت انتہائی با اثر شخصیت کی ہو گئی کہ جس سے حکمراں بھی خوف زدہ رہتا تھا' اور اس کے خلاف کسی قسم کا اقدام نہیں اٹھاتا تھا-

برطانوی ہند کی جانب سے سفیر کی حیثیت سے سر جان مالکم نے ایران میں قیام کیا- (۱۷۹۹- ۱۸۰۱ اور ۱۸۰۸) اپنے مشاہدات پر اس نے بعد میں ایک کتاب تاریخ



ایران میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ۳ یا ۴ سے زیادہ مجتہد ہوں' ان کے کردار کے بارے میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ وہ بے داغ اور پاک ہوتا ہے اور وہ دنیاوی معاملات میں دلچسپی نہیں لیتے ہیں۔ نہ ہی یہ حکمراں سے کوئی تعلق رکھتے ہیں اور نہ حکومت کے عہدے داروں سے۔ اپنے اس رویہ کو وہ کبھی بھی تبدیل نہیں کرتے ہیں کیونکہ اس کے نتیجہ میں وہ فوراً اپنی حیثیت اور اثر و رسوخ کو کھو بیٹھتے ہیں' کیونکہ اس کے بعد نہ تو کوئی ان کی بات سنتا ہے اور نہ ہی ان سے مشورہ طلب کرتا ہے اور اس کے بعد ان کی عزت بادشاہ کی نظروں میں بھی گر جاتی ہے' اور وہ بھی ان کی رہائش پر نہیں آتا ہے۔ جب ایک مجتہد کی وفات ہوتی ہے تو اس کا جانشین اسی کو بنایا جاتا ہے کہ جس کا مذہبی مقام بلند ہو اور جو علوم مذہبی میں مہارت رکھتا ہو.....

ایران میں مجتہد کا اثر اور اس کی رائے' عدالتی کارروائی' قانون کے استعمال اور قاضیوں کے فیصلے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ عام طور سے مقدمہ کے سلسلے میں مسلسل اس کی رائے طلب کی جاتی ہے اور وہ جو فیصلہ کر دیتا ہے اس کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ سوائے اس کے کہ دوسرا مجتہد جس کا علم اس سے زیادہ ہو' اس کی مخالفت کرے اور اپنی رائے دے۔ ایران کے لوگوں کو مجتہدوں کی وجہ سے بہت سہولتیں ہیں... بادشاہ جو اکثر کسی کی بات نہیں سنتا ہے۔ مجتہد کی رائے اور مشورہ کو تسلیم کرتا ہے' اور جب وہ کسی مجرم کے سلسلہ میں سفارش کرتا ہے تو اس کی بات مانتا ہے۔ مجتہدوں

کی رہائش گاہیں مظلوم لوگوں کے لئے پناہ گاہ سمجھی جاتی ہیں اور وہاں ظالم کے ہاتھ نہیں پہنچ سکتے ہیں..."

عثمانی سلطنت میں بھی علماء کو انتظامیہ کا ایک حصہ بنا کر ان کی علیحدہ حیثیت کو ختم کر دیا۔ ان کی سلطنت میں جو سب سے بڑا مذہبی عہدہ ہوتا تھا وہ شیخ الاسلام کہلاتا تھا' اپنے عہدے اور مرتبہ کے لحاظ سے یہ سلطان سے براہ راست مل سکتا تھا اور اسے مشورہ دے سکتا تھا۔ اس کے بعد عدالتی ملازمتوں میں انہوں نے قاضیوں کا تقرر کیا۔ ان کے ہاں دو قاضی عسکر ہوتے تھے' جن میں سے ایک بلقان کے لئے تھا اور دوسرا اناطولیہ کے لئے

اس کے علاوہ تمام بڑے شہروں میں قاضوں کا تقرر ہوتا تھا اور پھر یہ قاضی اپنی انتظامی ذمہ داریوں کے تحت مختلف درجوں میں بٹے ہوئے تھے۔ جائداد کی لین دین' یتیموں کے اداروں کی دیکھ بھال اور دوسری عدالتی کارروائیوں میں مصروف ہوتے تھے۔

قاضی سلطنت میں قائم شدہ مدرسوں کے انتظامات کے بھی ذمہ دار تھے' یہ ریاست کی جانب سے عائد کردہ ٹیکس کی مذہبی لحاظ سے تصدیق بھی کرتے تھے' اس کے علاوہ دست کاروں اور ہنر مندوں نے جو پیشہ ورانہ انجمنیں بنا رکھی تھیں' ان پر بھی یہ نظر رکھتے تھے۔ قاضی کے عہدے پر انہیں' تقرر ہوتا تھا کہ جو مدرسہ سے فارغ التحصیل ہو۔ قاضی کے ساتھ ساتھ مفتیوں کے عہدے ہوتے تھے' جو مختلف مسائل پر فتوے دیا کرتے تھے۔

اس طرح سے عثمانی سلطنت نے تعلیم اور عدالتی انتظام کے ذریعہ علماء کو ملازمت میں لے لیا' جنہوں نے مذہبی اداروں پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔

لیکن ان علماء کا ذہن ان تمام باتوں کے باوجود تنگ ہی رہا' اور انہوں نے زندگی

کے معاملات کو ہمیشہ محدود و نقطہ نظر سے ہی دیکھا اور بدلتے ہوئے حالات میں جو آزاد خیالی اور ہمہ گیریت عثمانی معاشرہ میں آ رہی تھی اس کی بھرپور مخالفت کی' مثلاً ۱۰۸۰ء میں انہوں نے مدرسہ سلیمانہ کی رصد گاہ پر حملہ کرکے اسے تباہ و برباد کر دیا۔ سولھوں اور سترہویں صدیوں میں انہوں نے اصلاح مذہب کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا' اور ان تہواروں اور رسومات کی مخالفت کی کہ جو ان کے نزدیک غیر اسلامی تھیں۔

یہاں تک کہ انہوں نے کافی کے پینے اور تمباکو کے استعمال کو بھی غیر اسلامی قرار دے دیا اور حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ تمام غیر اسلامی اداروں اور روایات کو ختم کرکے شریعت کا نفاذ کرے۔

جب ترکی میں چھاپہ خانہ کے قیام کا مسئلہ پیش آیا تو اس پر شیخ الاسلام نے یہ فتویٰ دیا کہ پریس کو اس صورت میں لگانے دیا جائے کہ اس میں قرآن شریف نہیں چھپے' باقی دوسرا ادب چھاپنے کی اجازت ہو گی۔

چنانچہ احیاء کی تحریکوں میں انہوں نے صوفیاء کے خلاف بھی پروپیگنڈا کیا اور خاص طور سے ترکی میں مولانا رومی کے پیروکار درویشوں میں جو رقص ہوتا تھا اس کی بھرپور مخالفت کی۔ ترکی میں چونکہ غیر مسلم اقلیتیں کافی تھیں' جن میں خصوصیت سے عیسائی اور یہودی قابل ذکر تھے' اس لئے انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے لوگوں میں گھل مل کر نہیں رہنا چاہیے کیونکہ اس ملاپ کے نتیجہ میں مذہب خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔

اسی طرح انہوں نے تمام دانشورانہ' فلسفیانہ اور آزاد خیال بحث و مباحثوں کو بند کرانے کی کوششیں کیں۔ اس پورے عہد میں یہ علماء اگرچہ ظاہری طور پر تو بڑے

پارسا اور دیندار بنتے تھے' مگر ان کے عمل میں بڑا تضاد تھا اور یہ ریاست و سلطنت کے عہدوں کو استعمال کر کے دولت و طاقت کے حصول کے لئے سازشوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔

اس لئے اگرچہ یہ علماء عثمانی سلطنت کا ایک حصہ تو بن گئے' اور انہوں نے سلطنت کے خلاف کوئی تنقید نہیں کی مگر اپنے تحفظ کے لئے انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ معاشرہ کو قدامت پرست اور مذہبی رہنے دیا جائے تاکہ اس میں ان کی اہمیت برقرار رہے۔ کیونکہ ان کا خوف حق بجانب تھا کہ آزادانہ خیالات کی وجہ سے ان کی عزت و احترام ختم ہو جائے گا۔

آگے چل کر حکومت اور علماء دونوں کے مفادات مل گئے' اور انہوں نے متحدہ طور پر نئے خیالات کی روک تھام کی۔ سیاسی و معاشی اور سماجی تبدیلیوں کو روکا۔ اسی رجحان کی وجہ سے عثمانی سلطنت میں زوال کے اسباب پیدا ہوئے۔

علماء عہد سلطنت میں

ہندوستان میں جب ترکوں نے سلطنت قائم کی تو یہاں بھی انہوں نے علماء کو ریاست میں اعلیٰ عہدے دے کر انہیں اس کا ایک حصہ بنا دیا' ان عہدوں میں صدر الصدور' قاضی القضاۃ اور شیخ الاسلام کے عہدے قابل ذکر تھے۔ ۱۲۴۸ء میں صدر جہاں کا عہدہ قائم ہوا کہ جس کا کام یہ تھا کہ وہ ملک میں مذہبی سرگرمیوں کی دیکھ بھال کرے' انصاف قائم کرے' مسلمانوں سے نماز پڑھوائے' مارکیٹ میں اشیاء کی قیمتوں اور وزن کو دیکھے' اور وقف کی جائدادوں کی نگرانی کرے۔

سلاطین نے مسجدوں میں اور مدرسوں میں اساتذہ کے تقرر کو بھی ریاست کے ماتحت رکھا کیونکہ انہیں باقاعدہ سے تنخواہیں دی جاتیں تھیں' مشہور علماء کے لئے انہوں نے خصوصیت سے مدرسے قائم کئے تاکہ وہ مذہبی تعلیم میں مشغول رہیں۔ ریاست اور علماء کے اشتراک کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء نے ریاست کے ساتھ تعاون کیا' اور جب بھی حکمرانوں کو ان کی ضرورت پڑی تو ان کی خدمات سے پورا پورا فائدہ

اٹھایا گیا۔ مثلاً حکومت کے خلاف بغاوتوں میں ان کو استعمال کیا گیا کہ یہ باغیانہ

خیالات کے خلاف کام کریں اور لوگوں کو بادشاہ کی وفاداری پر آمادہ کریں' اگر کبھی محصولوں کی وصول یابی میں دقت ہوتی تو ایسے مواقع پر بھی ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا۔

سلاطین نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ علماء سے اچھے تعلقات رکھے جائیں' ان کا احترام کیا جائے' ان کی محفلوں میں جایا جائے' انہیں دربار میں دعوتوں پر بلایا جائے' ان کے ساتھ مذہبی بحث و مباحثے کئے جائیں۔ انہیں وقتاً" فوقتاً" تحفے تحائف دیئے جائیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انہیں حکومت کی پالیسیوں سے دور رکھا جائے' اور انہیں حکومت کے معاملات میں شریک نہیں کیا جائے بلکہ عمدگی سے انہیں ان سے دور رکھا جائے' مثلاً جب التمش (وفات۔ ۱۲۳۶) کے زمانہ میں علماء نے اس سے کہا کہ ہندوؤں کے ساتھ اہل کتاب جیسا سلوک نہیں ہونا چاہیے' انہیں ذمی قرار دینا چاہیے اور' اگر وہ انکار کریں تو کافر قرار دے کر ان کا قتل عام کرنا چاہیے تو التمش نے ان کی بات سن کر اپنے وزیر کے یہ کہلوا دیا کہ "حکومت کے پاس فی الحال اتنی تلواریں نہیں کہ تمام ہندوؤں کو قتل کریں" اس لئے مناسب یہ ہے کہ انہیں ذلیل و خوار رکھا جائے۔

اس لئے سلطان بلبن (وفات۔ ۱۲۸۷) اگرچہ ظاہری طور پر علماء کی بڑی قدر کرتا تھا اور ان کے ساتھ بڑے احترام کے ساتھ پیش آتا تھا مگر اس کی حکومت کے طریقے ایرانی تھے' خود کو وہ افراسیاب کی اولاد بتاتا تھا' اور اپنے دربار میں جن رسومات کو رواج دیا تھا وہ تمام کی تمام قدیم ایران کے بادشاہوں کی تقلید تھی۔

اس طرح باغیوں کو سزائیں دینے میں مذہب کو کوئی دخل نہیں تھا' اور یہ

سزائیں اپنے مفادات اور ملک کی ضروریات کے تحت دی جاتیں تھیں اور سلاطین نے تو اس کا برملا اظہار نہیں کیا' مگر علاء الدین خلجی (وفات ۱۳۱۶) نے علماء کو ریاست کے معاملات سے بالکل دور رکھا۔ اس نے اس بات کا برملا اظہار کیا کہ وہ صرف وہ کام کرتا ہے کہ جس سے رعایا کی فلاح ہو' اسے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ اس کے اقدامات شریعت کے خلاف ہیں یا اس کے مطابق۔

سلطان محمد تغلق (وفات ۱۳۵۱) خود ایک عالم تھا لہٰذا اس نے اس بات کی کوشش کی کہ علماء کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرے' ان میں سے جن علماء نے اس کا ساتھ دیا انہیں اس نے انعام و اکرام سے نوازا' مگر جن چند علماء نے مخالفت کی تو انہیں اس نے قتل کرا دیا اور بعد میں ان علماء کا زور توڑنے کے لئے اس نے انہیں تبلیغ اسلام کے لئے دور دراز کے علاقوں میں زبردستی بھجوایا۔ خصوصیت سے جب اس نے دیو گیر کو اپنا دارالحکومت بنانا چاہا' تو وہاں علماء کی ایک بڑی تعداد کو روانہ کیا۔ اس وجہ سے علماء کے طبقہ میں اس کے خلاف زبردست جذبات پیدا ہوئے اور جب ملک میں اس کے خلاف بغاوتوں کی ابتداء ہوئی تو انہوں نے ان میں کسی نہ کسی طرح سے حصہ لیا۔

لیکن مجموعی طور پر علماء نے سلطان وقت کا ساتھ دیا' اور اس کے عوض انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ ایسی تمام تحریکوں کو ریاست کے ذریعہ ختم کروا دیا جائے کہ جو ان کے نزدیک مذہب کے خلاف تھیں۔

سلطنت کے دور میں علماء نے صوفیوں کو اپنا مخالف جانا کیونکہ یہ صوفیا اگرچہ دربار سے تو واسطہ نہیں رکھتے تھے۔ مگر ان کا اثر و رسوخ عوام میں اور امراء میں بہت تھا اس لئے علماء ان کی سرگرمیوں کو خلاف شریعت کہہ کر ریاست کو ان کے

خلاف بھڑکاتے رہتے تھے۔ انہیں میں سے وہ مشہور تنازعہ ہے کہ جب انہوں نے

صوفیاء کے سماع کو خلاف شریعت کہا اور نظام الدین اولیاء کو خاص طور سے مناظرے کے لئے دربار میں بلوایا' اس کے علاوہ ایسی تمام تحریکوں' اور فرقوں کے خلاف تھے کہ جو سنی عقیدے سے روگردانی کرتی تھیں۔ اس کی ایک مثال سوری سلاطین کے زمانہ میں مہدویہ تحریک ہے کہ جس کے بانی سید محمد مہدی جونپوری (وفات۔ ۱۵۰۴) تھے۔ اس تحریک کو اسلام شاہ (وفات ۱۵۵۴) کے زمانہ میں شیخ علائی کی وجہ سے بڑا فروغ ہو گیا تھا' لہٰذا ان کے خلاف مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری نے بادشاہ سے شکایات کیں اور ۱۵۴۸ء میں انہیں کوڑے مار مار کر قتل کرا دیا' اس سے پہلے یہی سلوک وہ عبداللہ نیازی کے ساتھ کر چکے تھی۔

مخدوم الملک اس ضمن میں ان تمام علماء کے خلاف تھے کہ جن کے عقائد پر انہیں شبہ تھا ان میں ابوالفضل و فیضی کے والد شیخ مبارک بھی شامل تھے۔ لہٰذا ان کی اس پر تشدد پالیسی کے خلاف علماء کئی گروہوں میں تقسیم ہو گئے' ان میں سے کچھ نے خود کو سیاست سے بالکل علیحدہ کر لیا اور کچھ اپنے مفادات کے لئے ریاستی علماء سے مل گئے۔

اس لئے جب مغل اقتدار میں آئے ہیں تو ہندوستان میں کئی رجحانات سرگرم تھے۔ اول' ریاستی علماء جو تشدد کے ذریعہ اپنے مخالفین کو ختم کرانے میں مصروف تھے' دوئم' اصلاحی اور احیاء کی تحریکیں جو اسلام کو بدعتوں سے پاک کرکے اس کا احیاء کرنا چاہتی تھیں' جیسے مہدوی' جو اپنی جگہ پر تشدد تھے اور سختی سے اپنے عقائد کا نفاذ چاہتے تھے' سوئم صوفی' جو علماء کے تشدد کو توڑنا چاہتے تھے اور چہارم بھگتی تحریک جو ہر مذہب و عقیدے میں ہم آہنگی پیدا کرکے رواداری کی فضا پیدا کرنا چاہتے تھے۔

ان میں سے صرف علماء کا گروہ ایسا تھا جو ریاست کا ایک حصہ ہوتے ہوئے تشدد کے ذریعہ اپنے عقائد کو نافذ کرنا چاہتے تھے' اس لئے مغلوں کے اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے کوشش کی کہ مغل حکمران کو اپنے زیر تسلط کریں اور اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کریں۔

یہ انہیں دنوں کا واقعہ ہے کہ جب ان عالموں کا اکبر کے دربار میں عروج تھا اور

وہ ریاست کی طاقت کو اپنے مذہبی مقاصد کے لئے استعمال کر رہے تھے' اور جن علماء پر انہیں شبہ ہوتا تھا کہ وہ سنی عقائد سے علیحدہ ہیں انہیں قید و بند کی سزاؤں سے لے کر قتل کی سزا دیتے تھے۔ ان کے انہیں حریفوں میں ابو الفضل کا باپ شیخ مبارک تھا' جس پر مہدوی ہونے کا شبہ تھا' اور اسی بنا پر یہ اس کے خلاف تھے اس دور میں ان کے خاندان پر جو کچھ بیتی' اس کا ذکر ابو الفضل نے آئین اکبری کی تیسری جلد میں اپنے خاندانی حالات میں کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب علماء کو ریاستی طاقت مل جائے تو وہ پھر کس طرح تشدد کے ذریعہ خوف و دہشت گردی کی فضا پیدا کرتے ہیں اور مذہب کے نام پر لوگوں کو ختم کراتے ہیں۔

واقعہ اس طرح سے پیش آیا کہ مخدوم الملک اور عبدالنبی صدر کے حکم سے شیخ مبارک کی گرفتاری کا حکم ہوا۔ انہیں اس کی اطلاع ایک خیر خواہ نے دی اور یہ خاندان پریشانی کے عالم میں رات کو گھر چھوڑ کر پناہ کی غرض سے روانہ ہوا۔

> مجبوراً اس آدھی رات کو ہم تین آدمی پیادہ گھر سے باہر نکلے اور نہ کوئی راہبر موجود تھا اور نہ رفتار کے لئے پاؤں میں قوت استقلال تھی ... صبح صادق کے وقت ہم اس شخص کے دروازے پر پہنچے۔ یہ شخص اپنی واقفیت کے اعتبار سے گرم خوئی اور کشادہ پیشانی کے ساتھ ملا اور ایک بستر خلوت کدہ خالی کرکے ہمارے لئے معین کر دیا... اسی آرام کمرے میں دو روز بعد یہ خبر معلوم ہوئی کہ دل سوختگان حد نے شرم کا پردہ اٹھا کر اپنی خبث آگیں طبائع کے مافی الضمیر کو ظاہر کر دیا اور پختہ کاران مکاری کے قاعدے کے مطابق اس رات کی صبح کو بارگاہ سلطانی میں معروضہ پیش کرکے خاطر اقدس

(یعنی اکبر بادشاہ) کو مشوش کر دیا۔ بارگاہ خلافت سے فرمان جاری ہوا کہ ... چونکہ یہ بذات خود مذہب و ملت کا کام ہے لہٰذا اس کا انجام خاص طور سے تمہاری ضرورت (یعنی مخدوم الملک اور عبدالنبی) پر منحصر کیا جاتا ہے ان کو محکمہ عدالت میں طلب کریں اور جو امر کہ حکم شریعت کے مطابق طے پائے اور اکابر زمانہ اس سے متفق ہو جائیں عمل میں لائیں۔ مخالفین نے چاؤ شان (شاہی دستہ) شاہنشاہی کو برانگیختہ کر کے ہمارے بلانے کے لئے بھیجا... جب مخالفین نے ہم کو مکان میں نہ پایا... تو مکان کو گھیر لیا اور شیخ ابو الخیر میرے بھائی کو اس مکان میں پاکر اس کو اپنے ہمراہ آستانہ اقبال پر لے گئے اور بعید وضاحت کے ساتھ ہمارے مخفی ہونے کے حالات کو بیان کیا... شہریار حق بیں (اکبر) نے بخوبی تمام واقعات کو شناخت کر لیا اور مخالفوں کو یہ جواب دیا کہ تم لوگ اس قدر سخت گیری کیوں ایک درویش گوشہ نشیں، دانش منش، ریاضت کیش کے حق میں کرتے ہو اور کیوں اس قدر جنگجوئی سے کام لیتے ہو ... مخالفین اب اس خیال میں مبتلا ہوئے کہ اس وقت جبکہ یہ بے خانماں ہو چکے ہیں تو اس مسئلے کا علاج بخوبی کر لینا چاہیے اور چند اشخاص میں تیرہ دروں سیہ رائے کو اس پر مقرر کیا کہ جس مقام پر ہمارے نشان پائیں ہمارا کام تمام کر ڈالیں :۔ ایک ہفتہ جس وقت گزر گیا۔ صاحب خانہ بھی ہمارے اختیار سے جاتا رہا اور بے شرمی سے کام لینے لگا اور اس کے ملازمین بھی ناشناسی برتنے لگے۔ ان وجوہ سے عقل پر واہمہ غالب ہو گیا اور پریشان طبیعت کو اس امر کا یقین ہو گیا کہ ... بادشاہ جستجو میں اور تمام عالم دوڑ دھوپ اور کوشش میں مصروف ہے۔ اب گمان

غالب یہ ہے کہ صاحب خانہ ہم کو پکڑ کر مخالفین کے حوالے کر دے...

جب شام ہو گئی تو ہم نے بادل ناخواستہ... اس غم کدہ وحشت سے افزا سے پاؤں باہر نکالا۔ نہ کوئی مددگار نظر میں' نہ پاؤں میں طاقت رفتار' نہ جائے پناہ ظاہر' نہ زمانے کو سکون کہ دفعتاً" اس شب تار میں بجلی چمکی اور چہرہ خوشی سے دمک اٹھا کہ ہمارے ایک شاگرد کا مکان نظر آیا اور تھوڑی دیر کے لئے ہم کو آرام کی جگہ مل گئی (اس کے بعد اس خاندان نے ایک امیر کے ہاں پناہ لی) آدھی رات کے وقت وہ تیزدست و آگاہ دل ہمارے پاس پہنچا... اسی وقت ہم لباس لپیٹ کر روانہ ہو گئے اور مختلف راہوں سے اس شخص کے مکان پر آئے (لیکن اس نے بھی بعد میں ان سے بدسلوکی کی اور ان کی مہمان نوازی سے تنگ ہوا) رات کے وقت ہم اس جگہ سے نکل کر اپنے ایک دوست کے مکان میں آئے (ایک رات گزارنے کے بعد) جب سب سو گئے تو اس وقت ہم مقام نا معیّن کی جستجو میں چل نکلے... آخر کار پھر اسی امیر کے مکان پر آئے۔ (لیکن وہ امیر انہیں چھوڑ کر خود معہ ملازموں کے چلا گیا) صرف ہم تین آدمی نخاس کے قریب بیٹھے رہ گئے اور عجیب حال پیش آئی۔ نہ جانے کا ارادہ' نہ قیام کی طاقت' اور نہ کوئی پردے کی جگہ کہ جس میں قیام ہو سکے۔ ہر سمت منافق دوست اور دشمنان صدرنگ اور نادیدگان سخت پیشانی۔ ہم اس بے پناہ جنگل میں خاک کے اوپر بیٹھے تھے زمانہ کی آشفتہ سری اور مقاصد کی پراگندگی کے سبب سے ہم بے انتہا غم و الم میں گرفتار ہو گئے ... بیگانوں کی ملامت اور دوستوں کی بھی خواہی سے محفوظ ایک باغیچے میں پہنچے... دفعتاً" ہم پر یہ ظاہر ہوا کہ اس

باغیچے میں چند (بد انجام) مخالفین کا بھی گزر ہوتا ہے... پھر ظاہری حالت کی پراگندگی کے ساتھ اس باغیچے سے باہر نکلے۔ جس مقام پر پہنچتے اس بلائے ناگہانی کا سامنا ہوتا تھا... یہاں تک کہ... ایک باغبان نے ہم کو پہچان لیا۔ اس واقعے سے ہمارے حالت متغیر ہو گئی اور قریب تھا کہ روح سے جسم خالی ہو جائے... لیکن وہ سعادت مند گوناگوں مہربانیوں کے ساتھ پیش آیا۔ (اس کے بعد روپوشی کے لئے اس نے ایک خفیہ مقام کا پتہ بتایا) اور ایک پوشیدہ مقام میں ہم نے قیام اختیار کیا... اس مقام سے خطوط مخلصوں اور بہی خواہوں کے نام روانہ کئے گئے اور ہر شخص ہمارے حال سے واقف ہو کر اس کی چارہ جوئی میں مصروف ہوا... ایک ماہ تک اس آرام کی جگہ میں ہم نے بسر کی (لیکن یہاں سے بھی اس خوف سے کہ ان کی گرفتاری نہ ہو جائے روانگی اختیار کی) بے انتہا پریشانی اور اضطراب کی حالت میں ہم غیر آباد خرابے میں چلے آئے اور قدرے ہم کو شہر کے فسادات اور دشمن کی آنکھوں سے امن حاصل ہو گیا۔ (یہاں بھی انہیں سکون نہ ملا' تو یہ مزید امن کی جگہ کی تلاش میں روانہ ہوئے) ایک ناشناسا رہبر کو اپنے ہمراہ لے کر ایک قریے میں جو دارالخلافے سے متعلق تھا... روانہ ہو گئے۔ تین کوس کی بے راہ ساخت طے کرکے ہم لوگ یہاں پہنچے... (لیکن یہ بات معلوم ہوئی کہ یہاں بھی مخالف ان کی تلاش میں آنا چاہتا ہے) لہٰذا اس قریے کے قیام سے دستبردار ہو کر آدھی رات کے وقت ہم لوگ بادل خوار دنگوں شہر کی طرف روانہ ہوئے اور صبح کے وقت دارالخلافہ آگرہ پہنچ کر ایک دوست کے مقام پر مقیم ہوئے (اس کے بعد ان کے دوستوں نے دربار میں

بادشاہ سے ان کی سفارش کی اور ان کے بارے میں جو غلط فہمیاں تھیں انہیں دور کرنے کی کوشش کی۔ اس پر بادشاہ نے انہیں دربار میں بلایا) بارگاہ سلطان میں حاضر ہوئے اور جہاں پناہ کی گوناگوں نوازشات سے ان کو بلند پائیگی حاصل ہوئی اور یک بارگی یہ زنبور خانہ نا سپاساں خاموش ہو گیا۔

(آئین اکبری۔ سوم۔ ترجمہ۔ فدا علی طالب ص۔ ۳۳۹۔ ۴۱۴)

اکبر اور علماء

اکبر جب تخت پر بیٹھا ہے تو اس وقت مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اور صدر الصدور عبدالنبی سلطنت میں اہم علماء تھے کہ جو مذہب امور اور معاملات کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی دخل اندازی کرتے تھے۔ صدر کا عہدہ اس وقت انتظامیہ کے اہم عہدوں میں سے ایک تھا اور یہ ملک میں سب سے اعلیٰ فقہی اور قانونی اتھارٹی تھا' اور اس لحاظ سے تمام عدالتی نظام اس کے ماتحت ہوا کرتا تھا۔ تمام قاضی اور مفتی اس کے ماتحت ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ وقف کی زمینوں' جائدادوں' اور وظیفوں کا بھی انچارج ہوا کرتا تھا۔

اس حیثیت سے شیخ عبدالنبی مغل سلطنت کی اہم شخصیت تھے۔ اکبر ان کی ابتدا میں بہت عزت کرتا تھا اور ان کے گھر پر جا کر ان کے درس میں شریک ہوتا تھا' بلکہ جہاں گیر کو نوجوانی میں ان کی شاگردی میں دے دیا تھا۔ اپنے علم اور سیاسی طاقت کے زعم میں یہ انتہائی مغرور اور بدزبان ہو گئے تھے۔ اس کا اظہار وہ ایسے موقعوں پر

ضرور کرتے تھے کہ جب ضرورت مند اپنی مجبوریوں کی وجہ سے کام کے لئے ان کے



پاس آتے تھے۔

مثلاً جب اکبر نے یہ حکم صادر کیا کہ جن علماء کے پاس معاش کے طور پر زمینیں ہیں وہ صدر کے دفتر سے آ کر ان کی تصدیق کرائیں۔ اس کی وجہ سے پورے ملک سے علماء دارالحکومت میں جمع ہو گئے' ان میں سے وہ لوگ کہ جن کے تعلقات تھے انہوں نے تو آسانی کے ساتھ اپنی جائیدادوں کی تصدیق کرالی۔ مگر وہ علماء کے جن کی کوئی سفارش نہیں تھی انہیں صدر الصدور کے سیکرٹری عبدالرسول کو رشوت دے کر اپنا کام کرانا پڑا اور اس سلسلہ میں انہیں شیخ کے چوکیداروں' کلرکوں' اور صفائی کرنے والوں کی جھڑکیاں سنی پڑیں۔ (بدایونی' II۔ ص۔ ۲۰۶۔ ۲۰۸)

خود شیخ عبدالنبی کا یہ حال تھا کہ وہ لوگوں کے ساتھ بد تمیزی سے پیش آتے تھے اور ان کی بے عزتی کرتے تھے' بدایونی نے اس کا حال لکھتے ہوئے کہا ہے کہ جب وہ اپنی نشست پر غرور و تند مزاجی کے ساتھ بیٹھتے تھے تو وہ چاہے بڑا امیر ہو یا عالم ان سب کے ساتھ انتہائی بدادبی کا سلوک کرتے تھے اور کسی کے ساتھ تہذیب و مروت کا برتاؤ نہیں کرتے تھے۔

ظہر کی نماز کے لئے جب یہ وضو کرتے تھے تو اس وقت پانی کے چھینٹے اس قدر زور سے اڑاتے تھے کہ وہ امراء اور حاضرین کے کپڑوں اور چہروں کو تر کر دیتے تھے (بدایونی' II۔ ص ۲۰۸) ظاہر ہے کہ ان کی حرکتوں کی وجہ سے لوگ ان سے نالاں تھے اور ان کی عزت محض اس لئے کرتے تھے کہ ان کے پاس سیاسی اختیارات تھے۔

اکبر کے دربار کے دوسرے بڑے عالم مخدوم الملک عبداللہ سلطانپوری تھے' جن کی عزت و شہرت سوری خاندان کے زمانہ سے تھی مگر یہ مذہبی معاملات میں اسقدر

متشدد تھے کہ اپنے مذہبی مخالفوں کو اذیتیں دے کر مروا دیتے تھے۔ ان کی یہ بھی شہرت تھی کہ انہوں نے بڑا مال جمع کر لیا ہے۔ اسی لئے ان کے مرنے کے بعد ان کے ترکہ میں تین کروڑ نقد ملے' اکبر نے ان کے مرنے کے بعد ہی قاضی علی کے ان کے مال کی جانچ کے لئے بھیجا تو پتہ چلا کہ انہوں نے سونے کی اینٹوں کو اپنے گھر میں قبروں میں دفن کر رکھا تھا' بعد میں یہ اینٹیں اور ان کی کتابیں ضبط ہوئیں اور شاہی خزانے میں داخل ہوئیں (بدایونی' II- ص- ۳۲۱)

ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ زکوۃ سے بچنے کی خاطر یہ حیلہ کرتے تھے کہ سال کے ختم ہونے سے پہلے یہ اپنی تمام جائداد اپنی بیوی کے نام کر دیتے تھے اور سال کے خاتمہ پر دوبارہ اسے لے لیتے تھے۔ اس طرح حج کے بارے میں ان کا یہ فتویٰ تھا کہ یہ فرض نہیں رہا ہے کیونکہ خشکی کے راستہ شیعوں کی سرزمین یعنی ایران سے گزرنا پڑے گا اور سمندر کے راستہ میں پر تگیزیوں کی پناہ میں آنا پڑے گا۔

پھر یہ دونوں علماء ایک دوسرے کے شدید مخالف تھے اور اس کوشش میں رہتے تھے کہ کسی طرح سے موقع ملے تو ایک دوسرے کو نیچا دکھایا جائے۔ علماء کے درمیان اس قسم کے ذاتی اختلافات اس وقت ابھر کر آئے جب اکبر نے عبادت خانہ کی بنیاد رکھی۔ (۱۵۷۴)

عبادت خانہ کی بنیاد رکھتے وقت اکبر روایتی طور پر مذہب کا پابند تھا۔ علماء سے اور صوفیا سے اس کی عقیدگی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ وہ خواجہ معین الدین اجمیری کے مزار پر زیارت کی غرض سے جاتا' سلیم چشتی کا اس قدر معتقد کہ جہانگیر کی پیدائش پر اس کی ماں کو ان کی درگاہ میں بھیجا تا کہ اس سے برکت ہو' اور اس کی پیدائش پر اس کا نام سلیم رکھا' بلکہ ان کی درگاہ کے قریب اس نے فتح پور سیکری کی



اس لئے عبادت خانہ کی تعمیر کا مقصد یہ تھا کہ علماء کو جمع کر کے مذہبی امور معاملات پر بحث و مباحثہ ہو' اور ان سے مذہب کے بارے میں سیکھا جائے' لیکن خود علماء کے سلوک' ان کی گفتگو' ان کی ایک دوسرے پر تنقید' اور ان کے رویہ نے اکبر پر دوسرے ہی اثرات ڈالے۔

ابتداء میں صرف خاص خاص علماء کو مدعو کیا جاتا تھا' اور یہ جلسہ جمعہ کی نماز کے بعد ہوا کرتا تھا۔ اکبر جب کبھی کبھی کسی عالم کے علم' اس کے تقدس' پرہیزگاری' اور کردار کے بارے میں سنتا تو اسے عبادت خانہ میں آنے کی دعوت دیتا اور ذاتی طور پر اس کا استقبال کرتا۔

لیکن جلد ہی علماء نے اس بات پر جھگڑا شروع کر دیا کہ کوئی کس جگہ پر بیٹھے گا' اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اکبر نے نشستوں کا انتظام خود سنبھالا۔ اور اس منصوبہ کے تحت درباری مشرق میں' سید مغرب میں' علماء جنوب میں' اور شیخ شمال میں بیٹھائے گئے۔

جب بحث و مباحثہ ہوتا تو بادشاہ خود ہر جماعت کے پاس جاتا ان کے درمیان بیٹھتا اور ان کی گفتگو میں شریک ہوتا' یہ ہر جماعت کے لوگوں کو انعام و اکرام سے بھی نوازتا۔

لیکن نشستوں کے اس انتظام کا باوجود علماء کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی' اور انہوں نے گفتگو کے دوران چیخنا' چلانا' اور بدتمیزی کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا' اکبر جو ان کے علم اور زہد و تقویٰ سے متاثر تھا۔ ان کو اس حال میں دیکھ کر بڑا مایوس ہوا اور اس کے دل سے ان کا احترام کم ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے بدایونی سے

کہا کہ اگر ان میں سے اب کوئی بھی بدتمیزی کرے' یا بکواس کرے تو اس کو عبادت خانہ سے نکال دو۔ اس پر بدایونی نے کہا کہ اگر میں نے اس حکم کی تعمیل کی تو پھر کوئی بھی عالم اس جگہ باقی نہیں رہے گا' اور ہر ایک کو نکالنا پڑے گا۔ (بدایونی' II۔ ص۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵)

مزید اختلافات کی ابتداء جب ہوئی کہ جب ایک دن تعداد ازواج پر گفتگو ہوئی' اکبر کی اس وقت چار سے زیادہ بیویاں تھیں اس پر سوال پیدا ہوا کہ چار کو رکھ کر باقی ناجائز ہوئیں' تو ان سے جو اولاد ہوئی وہ بھی ناجائز ہوئی' اس کی یہ بیویاں اکثر راجپوت شہزادیاں تھیں' ان کو اس طرح سے ناجائز رکھنا ان کی عزت و حمیت کا سوال تھا اسی لئے اکبر اس مسئلہ پر پریشان ہو گیا' اور اس نے علماء سے درخواست کی کہ اسے کسی طرح سے اس صورت حال سے نجات دلائی جائے۔ اس نے علماء کو یہ بھی بتایا کہ شیخ عبدالنبی صدر نے ایک مجتہد ابن ابی لیلہ کا حوالہ دیا ہے کہ جن کی ۹ بیویاں تھیں۔

اس پر علماء نے مذہبی تاویلات کا سلسلہ شروع کر دیا کچھ نے قرآن شریف کی اس آیت کا حوالہ دیا کہ جس میں کہ دو اور دو' تین اور تین اور چار اور چار شادیاں کرو" ان کی تاویل کے مطابق اس کا مطلب ہوا

$2 + 2 + 3 + 3 + 4 + 4 = 18$

یا $2 + 3 + 4 = 9$

اس موقع پر بدایونی نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ اگر مالکی قاضی یہ فتویٰ دے دے کہ متعہ کی شادی جائز ہے تو یہ فتویٰ شیعوں اور سینوں دونوں کے لئے ہو گا۔ اس پر اکبر نے فوراً حنفی قاضی کو ہٹا کر اس کی جگہ قاضی حسن عرب مالکی کو قاضی مقرر کر دیا' جس نے اس وقت متعہ شادی کے بارے میں فتویٰ دے کر بادشاہ کی تمام شادیاں



مگر اکبر نے مالکی قاضی کو بھی فوراً ہٹا کر دوبارہ سے حنفی قاضی کا تقرر کر دیا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی مثال کی دوسرے بھی تقلید کریں (بدایونی۔ II۔ ص۔ ۲۱۱۔ ۲۱۳)

اکبر کو ان مذہبی مباحث سے اس قدر دلچسپی بڑھی کہ وہ یہاں پر زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرنے لگا' خاص طور سے جمعہ کی رات کو وہ مذہبی تنازعات کو سمجھنے میں گزارتا۔ اس دوران میں علماء کا رویہ اسے دیکھنے کو ملا جو بحث کے دوران غصہ میں آ کر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتے' ان کی آوازیں بلند ہو جاتیں اور وہ ایک دوسرے کو کافر و مشرک کہنے لگتے۔ سب سے بڑا ستم تو یہ تھا کہ اس کے دربار کے دو بڑے عالم مخدوم الملک اور عبدالنبی ایک دوسرے کو کافر کہتے تھے۔ مخدوم الملک نے عبادت خانہ میں ہونے والی بحثوں پر تنقید کرتے ہوئے' عبدالنبی پر کفر کا فتویٰ صادر کیا کہ اس نے خضر خاں شروانی کو رسول اللہ کے خلاف برا کہنے کا الزام لگا کر اور میر حبش کو شیعہ قرار دے کر قتل کروا دیا' جب کہ دونوں باتیں جھوٹی تھیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ شیخ کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں کیونکہ اول تو انہیں والد نے عاق کر دیا تھا' دوئم انہیں خونی بواسیر ہے۔

شیخ عبدالنبی نے جواب میں مخدوم الملک پر اعتراضات کئے' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دربار میں دو جماعتیں بن گئیں اور ایک دوسرے کے خلاف زہر اگلنے میں مصروف ہو گئیں' ان کے اس رویہ سے اکبر بڑا دل گرفتہ ہوا' اور اس کی نظروں میں علماء کی عزت گھٹ گئی۔

اس کے بعد سے اکبر نے عبادت خانہ میں دوسرے فرقوں اور مذاہب کے لوگوں

کو دعوت دی- جن میں ہندو' جین' بدھ' عیسائی' مجوسی' اور کئی دوسرے مذاہب کے علماء شامل تھے' انہوں نے اپنے مذاہب کی خصوصیات بتائیں اور اکثر بحثوں میں انہوں نے علماء کو لاجواب بھی کر دیا-

اکبر کو اس وقت علماء سے سخت مایوسی ہوئی' جب کہ ان میں سے کچھ نے ایک چیز کو جائز قرار دیا اور دوسروں نے اسے حرام' اسی طرح جب اس نے قاضی جلال اور دوسرے علماء سے قرآن کی تفسیر لکھنے کو کہا تو وہ ہر بات پر ایک دوسرے سے اختلافات کرنے لگے-

ایک شیعہ عالم ملا محمد یزدی نے جب شیعہ نقطہ نظر سے ابتدائی اسلامی تاریخ کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا تو بادشاہ نے اس پر تاریخ کی کتابیں سنیں اور صحابہ کے اختلافات نے اس کا ایمان اور کمزور کر دیا-

اسی دوران میں ایک صوفی عالم شیخ تاج الدین اس کے دربار میں آئے' اور انہوں نے بادشاہ کے لئے سجدہ جائز قرار دیا' انہوں نے بادشاہ کو کعبہ مرادت اور قبلہ حجت قرار دے کر سجدہ کو تعظیمی بنا دیا کہ جو مذہب کے خلاف نہیں تھا- (بدایونی- II - ص- ۲۶۶)

۱۵۷۹ء میں ایک واقعہ پیش آیا کہ جس نے اکبر کو مکمل طور پر علماء کے خلاف کر دیا اس کی تفصیل یہ ہے کہ متھرا کے قاضی نے یہ شکایت کی کہ ایک برہمن نے مسجد کے تعمیری مواد میں کچھ اٹھا لیا' جب اس سے یہ واپس مانگا گیا تو اس نے یہ کہ نہ صرف دینے سے انکار کر دیا بلکہ رسول اللہ کی شان میں گستاخی بھی کی- شیخ عبدالنبی نے صدر کی حیثیت سے برہمن کو دربار میں حاضر ہونے کو کہا' مگر وہ نہیں آیا اس پر اکبر نے ابو الفضل اور راجہ بیربر کو تھرا تحقیقات کے لئے بھیجا- انہوں نے برہمن کے

خلاف لگائے ہوئے الزام کو درست پایا۔ اس پر علماء میں اختلاف ہو گیا کہ اسے کیا

سزا دی جائے' کچھ اس کے حق میں تھے کہ اسے سزائے موت دی جائے' مگر کچھ کہتے تھے کہ اسے کوڑے لگائے جائیں۔ اکبر چاہتا تھا کہ اس کی زندگی بچ جائے لیکن شیخ عبدالنبی نے اسے سزائے موت دے کر قتل کرا دیا اس واقعہ نے علماء اور بادشاہ کی طاقت کو بالکل واضح کر دیا کہ بادشاہ علماء کے آگے بے بس ہے۔ اس لئے نہ صرف اکبر بلکہ اس کی ہندو بیگمات اور درباریوں نے بھی اس پر تنقید کی کہ علماء اپنی طاقت سے زیادہ تجاوز کر گئے ہیں۔

اس پر اکبر نے عبادت خانہ میں علماء سے برہمن کے مسئلہ پر رائے لی' تو علماء کی اکثریت نے عبدالنبی کے خلاف فیصلہ سنایا۔ لہٰذا اس پر اکبر نے یہ فیصلہ کیا کہ علماء جس طرح سے سلطنت کے معاملات میں دخل دے رہے ہیں وہ اس کی صلح کل اور رواداری کے بالکل خلاف ہے' اور یہ بات اس کے سامنے بالکل واضح تھی کہ ہندوستان جیسے ملک میں کہ جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے' اور ہندو اس کی سلطنت کے حامی ہیں' وہاں وہ علماء کو یہ اجازت نہیں دے گا کہ وہ دوسرے مذاہب کے خلاف عمل کریں۔

لہٰذا اکبر نے اس موقع پر شیخ مبارک' ابو الفضل کے باپ کو دربار میں بلایا' اور اس سے کہا کہ وہ اسے ان مولوی سے نجات کیوں نہیں دلاتا۔ اس پر شیخ مبارک نے کہا کہ آپ مجتہد اور امام عادل کی حیثیت اختیار کر لیں' اور ان تمام علماء سے ایک محضر پر دستخط لے لیں۔ اس کے بعد ان کی کوئی طاقت و اختیار نہیں رہے گا اور آپ تمام مسائل پر اپنا فیصلہ دے سکیں گے۔ چنانچہ یہ محضر تیار ہوا اور اس پر تمام علماء سے دستخط کرائے گئے ان میں مخدوم الملک اور عبدالنبی بھی شامل تھے۔

اس پر ہی بس نہیں ہوا بلکہ کچھ علماء نے اکبر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اسے صاحب الزماں بنا دیا' کہ جو اسلام کے تمام فرقوں کو متحدہ کرے گا۔ شریف آملی نے ایک پرانی دستاویز دکھا کر یہ ثابت کیا کہ ۹۰۰ ہجری میں ایک شخص آئے گا جو دنیا سے تمام برائیوں کا صفایا کر دے گا۔ خواجہ مولانا شیرازی ایک پمفلٹ لے کر آئے جو کسی شریف مکہ کا لکھا ہوا تھا اور اس میں مہدی کے ظہور کی خوش خبری دی گئی تھی' اس کے بعد انہوں نے خود ایک رسالہ لکھ ڈالا جس میں اکبر کو مہدی قرار دے دیا۔ (بدایونی۔ II۔ ص۔: ۲۹۵)

اس کے بعد تو حالت یہاں تک ہو گئی کہ علماء' مفتی' اور قاضی بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے دربار اور شاہی پارٹیوں میں شراب تک پینے لگے۔ (بدایونی۔ II۔ ص۔ ۳۱۹)

اکبر نے جب علماء کے رویہ سے مایوس ہو کر مذہبی معاملات میں آزاد خیالی اختیار کی تو اس پر بھی کچھ علماء میں بے چینی پھیلی اور یہاں تک ہوا کہ اس پر کفر کے فتوے لگنا شروع ہو گئے۔ ان حالات میں اکبر نے فیصلہ کیا کہ علماء کی مخالفت' سلطنت میں ان کی دخل اندوزی' اور ان کے فساد کو ختم کیا جائے اس لئے اس سلسلہ میں تین باتوں پر عمل کیا۔

اول۔ ایسے علماء کہ جنہوں نے اس کے خلاف کفر کے فتوے دیئے تھے' اور عوام کو بغاوت پر اکسایا تھا' ان علماء کو اس نے گرفتار کرا کے کسی نہ کسی طریقے سے انہیں قتل کرا دیا۔ مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کو حج پر جانے کا حکم دیا' اور ساتھ میں ان سے کہا کہ وہ بغیر شاہی اجازت کے واپس نہ آئیں۔ لیکن جب وہ اس امید میں واپس آئے کہ اکبر کے خلاف بغاوتیں شروع ہو گئی ہیں اور شاید وہ دوبارہ سے اقتدار

حاصل کر لیں، تو اکبر نے دونوں کو قید میں ڈلوا دیا اور پھر انہیں بھی قتل کرا دیا۔

دوم۔ پنجاب کے علماء جن کے بارے میں اکبر کو خیال تھا کہ اس کے خلاف ہیں، انہیں ہندوستان کے مختلف حصوں میں بھیج دیا۔ اور اس طرح سے ان کی اس طاقت و اثر کو ختم کر دیا کہ جو ایک جگہ رہنے کی وجہ سے تھا۔

سوم۔ اکبر نے تمام مشہور علماء کو دربار میں طلب کیا، ذاتی ملاقات اور گفتگو کے بعد انہیں مدد معاش کے طور پر زمینیں دیں، اس طرح سے اس نے اول ان کی وفاداری کو جانچا اور پھر ان کی مالی امداد کو جاری رکھا۔

اس طرح اکبر نے صرف ان علماء کو ریاست کی ملازمت میں رکھا کہ جو اس سے وفادار تھے، اس نے ان کے مذہبی خیالات سے کوئی غرض نہیں رکھی لیکن اس بات کا خیال رکھا کہ وہ لوگوں میں بغاوت و فتنہ و فساد پیدا نہ کریں۔

اس کے بعد اس کا دوسرا قدم یہ تھا کہ سلطنت کے اہم معاملات کو علماء کے بجائے دانشوروں کے ہاتھوں دیا جائے، اس لئے حکیم ابو الفتح، حکیم ہمام، حکیم علی، حکیم عین الملک اور شیخ فیضی وہ لوگ تھے جو دربار میں اہم ہو گئے اور بادشاہ کو مشورے دینے لگے۔ اکبر نے اسی قسم کے دانشوروں کو کہ جن کے مذہبی خیالات لبرل ہوں، انہیں بڑے شہروں میں اہم عہدوں پر مقرر کیا تاکہ وہ وہاں قاضیوں اور علماء پر نظر رکھیں۔ (احمد شبیر۔ ۱۵۷)

اکبر کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تو دربار سے علماء کے اثر و رسوخ کا خاتمہ ہو گیا، اور اسے اس بات کا موقع مل گیا کہ وہ آزادی کے ساتھ صلح کل اور رواداری کے ساتھ حکومت کر سکے۔ علماء کے زوال کے ساتھ ہی لوگوں میں اکبر کے عقائد کے بارے میں جو باتیں پھیلیں تھیں ان کا بھی آہستہ آہستہ خاتمہ ہو گیا، اکبر

اور اس کے بعد اس کے دو جانشین جہاں گیر شاہ جہاں ان کے اثر سے آزاد رہے' اور مغلوں نے ایک ایسی سیکولر پالیسی کو اختیار کیا کہ جس میں مذہبی تنگ نظری اور تشدد نہیں تھا۔

اورنگ زیب اور علماء

اکبر نے اپنی سیکولر پالیسیوں کو برقرار رکھنے کے لئے علماء کے اثر و رسوخ اور سلطنت میں ان کی مداخلت کو بالکل ختم کر دیا' اس کے بعد جہاں گیر شاہ جہاں نے کم و بیش اسی پالیسی کو اختیار کیا اور علماء کے اختیارات کو مذہبی امور تک محدود رکھ کر بادشاہ کے اختیارات کو قائم رکھا۔

مگر اورنگ زیب نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے علماء کو اپنے لئے استعمال کیا اور دوبارہ سے انہیں اختیارات تو دیئے' مگر بڑی ہوشیاری کے ساتھ انہیں اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے کام میں لایا۔ علماء کو جب اختیارات ملے تو بجائے اس کے کہ وہ انہیں شریعت کے فروغ کے لئے استعمال کرتے' انہوں نے انہیں اپنے ذاتی فوائد کے لئے استعمال کیا' اور رشوتوں' غبن' اور دوسرے ناجائز ذرائع سے دولت اکٹھی کرنا شروع کر دی' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں ایسی کوئی اخلاقی جرات نہیں رہی کہ وہ بادشاہ کو شریعت کے نفاذ پر مجبور کر سکیں۔ مثلاً اس کا قاضی القضاۃ عبدالوہاب' رشوت

لینے کے سلسلہ میں بڑا بدنام تھا۔ اس کے مرنے پر ترکہ میں اس نے ۲ لاکھ اشرفیاں اور ۵ لاکھ روپوں کے علاوہ ہیرے، جواہرات، اور دوسرا بیش قیمت مال چھوڑا۔ خافی خاں نے لکھا ہے کہ اس کے اختیارات اس قدر زیادہ تھے کہ بڑے بڑے امراء بھی اس پر رشک کرتے تھے، اور اس کے سامنے انہیں اپنی آبرو بچانے کی فکر پڑ جاتی تھی۔ (خافی خاں۔ سوم۔ ص ۱۹۹۔ ۲۲۶)

اسی لئے اورنگ زیب نے ابتداء ہی سے علماء کے ذریعہ اپنے سیاسی مقاصد پورے کئے مثلاً جب داراشکوہ کو گرفتار کیا گیا تو اس نے سب سے پہلے ہیبت خاں نامی سپاہی کے خلاف فتویٰ حاصل کیا کہ جس نے داراشکوہ کے حق میں مظاہرے کرائے تھے، اسے قتل کرانے کے بعد، فقہا سے دوسرا فتویٰ داراشکوہ کے خلاف لیا کہ جس میں اس پر الزام لگایا گیا تھا اس نے شرع سے تجاوز کرکے کفرو الحاد پھیلایا۔ اسے اس فتویٰ کی بنیاد پر نہ صرف قتل کیا بلکہ اس کی لاش کی تشہیر بھی کرائی۔ (خافی خاں۔ سوم۔ ص۔ ۹۴)

اپنے دوسرے بھائی شہزادہ مراد کو جب راستہ سے ہٹانا مقصود ہوا تو اس پر علی نقی نامی ایک شخص کے قتل کا الزام لگا کر اس کے بیٹوں کے ذریعہ باپ کے خون کا دعویٰ کرایا گیا۔ قاضی نے خون کو ثابت کرکے اسے سزائے موت دے دی۔ (خافی خاں۔ سوم۔ ص۔ ۱۵۱)

اس طرح اورنگ زیب نے دارا کے ساتھیوں پر شرعی الزامات لگا کر ان کو قتل کرایا جن میں سب سے مشہور قتل صوفی سرمد کا ہے۔

اس لئے اگرچہ اورنگ زیب نے اپنی ریاست کو اسلامی شکل دینے کی ضرور کوشش کی اور اس مقصد کے لئے اس نے ایسے اقدامات بھی کئے کہ جن سے ظاہر

ہوتا تھا کہ وہ شریعت کے نفاذ میں دلچسپی رکھتا ہے' مثلاً شراب اور ہندوؤں کی زیارت پر پابندی لگائی' موسیقی کو دربار سے ختم کرایا' بادشاہ کے لئے درشن کی جو رسم تھی اسے منسوخ کیا۔ زائچہ و نجوم پر پابندیاں لگائیں اور بہت سے غیر شرعی ٹیکسوں کو ختم کیا۔ اس کے علاوہ اس نے عدل و انصاف کے محکمہ کو علما کے سپرد کرکے انہیں وسیع اختیارات دیئے۔

مگر اس کی یہ ساری کاروائیاں مغل سلطنت کے زوال کو روکنے میں ناکام ہو گئیں' چونکہ اکبر نے جو رواداری کی پالیسی اختیار کرکے ہر مذہب و عقیدے اور قوم کو مغل سلطنت کا حصہ بنایا تھا' وہ اس پالیسی کے تحت ناممکن تھا اسی لئے آہستہ آہستہ مختلف جماعتیں' فرقے' اور قومیں علیحدہ ہونا شروع ہو گئیں' اور مغل قوت و طاقت میں دراڑیں پڑنے لگیں۔

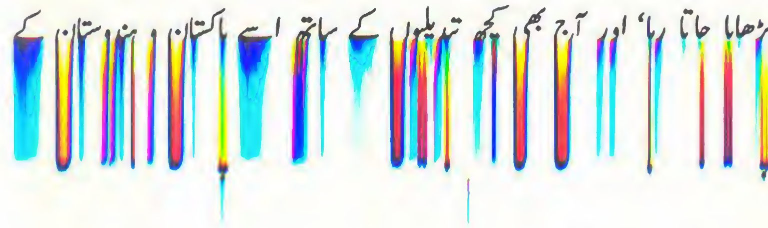
اورنگ زیب نے اگرچہ علماء کو بڑے اختیارات دیئے' مگر ان علماء میں نہ تو صلاحیت تھی اور نہ قابلیت کہ وہ سلطنت کی خرابیوں کو سمجھ سکتے۔ اس لئے وہ بھی سلطنت کا ایک حصہ بن کر دنیاوی فوائد سے لطف اندوز ہونے لگتے اور اس طرح انہوں نے بھی سلطنت کے زوال کو تیز کرنے میں حصہ لیا۔

علماء کی اس کمزوری اور ان کی نا اہلی کا احساس شاید اورنگ زیب کو بھی ہو گیا تھا' اس لئے اس نے فقہ عالمگیری کی تدوین شروع کرائی اور جب یہ مکمل ہو گئی تو اس بات کا اظہار کیا کہ یہ اس قدر مکمل اور جامع فقہ کی کتاب ہے کہ اس کے بعد مسلمانوں کو علماء سے فتویٰ لینے اور مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی اور یہ انہیں علماء کی ضرورت سے آزاد کرا دے گی۔

مدرسہ اور نصاب تعلیم

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے' مسلمان حکمرانوں نے علماء کو ریاست میں ضم کر کے انہیں ریاستی عہدے دیئے اور خاص طور سے محکمہ انصاف و قانون ان کے حوالے کر دیا۔ اس لئے علماء کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ مدرسوں کا نصاب اس قسم کا تیار کریں کہ جو علماء کو ان عہدوں کے لئے تیار کر سکے۔ اس مقصد کے لئے ابتداء میں سلجوق وزیر نظام الملک طوسی نے ایسے مدرسوں کی بنیاد ڈالی جو اسلامی حکومتوں کی ضروریات کو پوری کر سکیں۔ بعد میں اس کی دوسرے مسلمان حکمرانوں نے بھی سرپرستی کی۔

ہندوستان میں اس قسم کے نصاب کی تیاری میں ملا نظام الدین (وفات ۱۷۴۸) کا بڑا حصہ ہے کہ جن کا تعلق فرنگی محل خاندان سے تھا' اور جن کی شہرت بحیثیت استاد کے ہندوستان بھر میں تھی۔ انہوں نے جو نصاف تیار کیا وہ "درس نظامیہ" کہلاتا ہے۔ یہ نصاب اس قدر مقبول ہوا کہ ایک سو سال تک بغیر کسی تبدیلی کے ہندوستان میں


پڑھایا جاتا رہا، اور آج بھی کچھ تبدیلیوں کے ساتھ اسے پاکستان و ہندوستان کے
مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے۔

درس نظامیہ کی تدوین اس غرض سے کی گئی تھی کہ اس سے فارغ التحصیل طلباء مسلمان حکومتوں میں قاضی، مفتی، اور صدر کے عہدوں پر کام کر سکیں۔ اس نصاب کو اس طرح سے تیار کیا گیا تھا کہ ۲۰ سال کی عمر میں طالب علم فارغ التحصیل ہو جاتا تھا، جو کہ دوسرے نصابوں میں نہیں تھا، اور طالب علموں کو عمر کا بڑا حصہ ان کے مطالعہ میں گزرنا پڑتا تھا۔

اس وقت تک مدرسہ میں جو نصاب رائج تھے، ان میں دو قسم کے علوم پڑھائے جاتے تھے۔ معقولات، وہ علوم کہ جن کا تعلق عقلیت سے تھا، اور منقولات کہ جو احادیث پر مبنی تھے۔ درس نظامیہ کی یہ خصوصیت تھی کہ یہ معقولات پر منقولات سے زیادہ زور دیتا تھا، اور اس میں پہلی مرتبہ دوسرے علماء کی کتابوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی علماء کی تحریر کردہ کتابیں بھی شامل کی گئیں تھیں۔

درس نظامیہ میں جو علوم پڑھائے جاتے تھے ان میں صرف و نحو، منطق، حکمت، ریاضی، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، کلام، تفسیر اور حدیث شامل تھیں۔

شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان نے مدرسہ رحیمیہ میں اس کے مقابلہ میں جو نصاب تیار کیا اس میں انہوں نے معقولات سے زیادہ زور منقولات پر دیا اور فقہ کی تعلیم کے بجائے قرآن و حدیث کی تعلیم کو زیادہ ضروری قرار دیا۔ اس طرح ہندوستان میں یہ دو نصاب دو رجحانات کی نشان دہی کرتے تھے: فرنگی محل، مسلمان ریاستوں کے لئے علماء تیار کرتا تھا کہ جنہوں نے اٹھارویں صدر میں ان مختلف ریاستوں میں اہم کردار ادا کیا اور جیسا کہ مٹکاف نے لکھا ہے کہ "کہ جہاں کہیں بھی مسلمان ریاست

تھی' فرنگی بھی اس کے دربار میں کوئی عہدہ چاہتے تھے' (۳۲-۳۳)

اس کے مقابلہ میں مدرسہ رحیمیہ ہندوستانی مسلمانوں میں مذہبی بے حسی کی شکایات کرتے تھے' اور اس لئے علماء کو اس بات پر تیار کرتے تھے کہ وہ مسلمان معاشرہ میں مذہبی اصلاحات اور احیاء کے ذریعہ ان میں مذہبی جذبہ اور روح کو پیدا کریں۔

مدرسہ رحیمیہ کے اس ماڈل کو ۱۸۶۷ء میں دیو بند میں اختیار کیا گیا۔ اس میں جو مضامین رکھے گئے تھے وہ یہ تھے بہ صرف و نحو' بلاغت' عربی ادب' اسلامی تاریخ' منطق' یونانی و عرب فلسفہ' علم مناظرہ' علم کلام' اقلیدس' طب یونانی' فقہ' اصول فقہ حدیث' تفسیر۔ بعد میں منطق اور فلسفہ کو نصاب سے نکال دیا گیا۔ اس پورے نصاب میں جدید تقاضوں کے تحت علوم کو شامل نہیں کیا گیا اور نہ ہی کسی یورپی زبان کو نصاب کا حصہ بنایا گیا۔

انیسویں صدی کے آخر میں کچھ علماء نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ علی گڑھ کی جدید یورپی تعلیم' اور دیو بند کے قدیم نصاب کے درمیان ایک ایسا نصاب تیار کریں کہ جو موجودہ ضروریات کو بھی پورا کرے' اور قدیم روایات کو بھی برقرار رکھے۔ اس مقصد کے لئے ۱۸۹۰ کی دھائی میں ندوۃ العلوم کی بنیاد رکھی گئی' لیکن علماء کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکی اور ندوۃ نے بھی جدیدیت کو چھوڑ کر قدیم راستہ کو اختیار کر لیا۔

جیسا کہ ان نصابوں سے ظاہر ہے جو طالب علم ان مدرسوں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے' وہ ذہنی طور پر اس قابل نہیں تھے کہ جدید حالات کو سمجھ سکیں' اور سیاسی و معاشی مسائل کو حل کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے کچھ نے تو اس بات

کی کوشش کی وہ مسلمان ریاستوں میں ملازمتیں حاصل کر کے وہاں خاموشی سے زندگی گزار دیں' مگر علماء کی اکثریت وہ تھی کہ جنہیں ملازمتوں کے مواقع نہیں تھے اور وہ اس بات پر مجبور تھے کہ وہ اپنی روزی کے لئے درس و تدریس کے پیشہ کو اختیار کریں' یا مبلغ کے طور پر کام کریں' یا پھر مسجدوں میں امام اور موذن بن کر زندگی کے دن گزاریں۔ اس لئے ان علماء کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا کہ وہ اپنی روزی کے لئے مذہب کو استعمال کریں۔

اس لئے نو آبادیاتی دور میں بہت سی مذہبی جماعتیں اور فرقے پیدا ہوئے جو لوگوں سے چندہ حاصل کرنے کے لئے اور ان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ان کے مذہبی جذبات کو ابھارتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی پورے ہندوستان میں جگہ جگہ نئے مدرسے کھلنا شروع ہو گئے اور نئی مسجدیں بننا شروع ہو گئیں تا کہ لوگوں کے چندوں سے ان کو پھیلایا جا سکے اور علماء کی بڑھتی ہوئی تعداد کو ان میں کھپایا جا سکے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف مختلف فرقوں میں لڑائی جھگڑے شروع ہوئے بلکہ اس نے فرقہ ورایت کو بھی ہوا دی' اور ہندو و مسلمانوں کے درمیان اختلافات کو گہرا کیا۔

نو آبادیاتی دور اور علماء

شاہ عبدالعزیز کے فتوے

ہندوستان میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت مضبوط ہو گئی اور اس نے سیاسی اقتدار حاصل کر لیا' تو اس کے ساتھ ہی ہندوستان کا سیاسی ڈھانچہ بھی تبدیل ہونا شروع ہو گیا اور مسلمان حکمران اور امراء کمزور ہو کر بے بس ہو گئے۔ لہٰذا ان حالات میں ان کے لئے یہ لازمی تھا کہ وہ ہندوؤں اور انگریزوں سے اپنے تعلقات کو نئے خطوط پر استوار کریں' لیکن اس مرحلہ پر یہ سوال بھی تھا کہ ان کی راہنمائی کون کرے؟ کیونکہ بادشاہتی ادارے کے کمزور ہونے کے ساتھ ہی اس کے تمام ماتحتی ادارے بھی زوال پذیر ہو چکے تھے' لہٰذا لوگوں نے علماء کی جانب رجوع کیا کہ وہ ان کی راہنمائی کریں۔

علماء کا نقطہ نظران بدلتے ہوئے سیاسی حالات میں ایک نہیں تھا۔ مثلاً ان میں کچھ اب ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے' جب کہ کچھ اسے اب تک دارامن یا ان

دونوں کے درمیان قرار دیتے تھے اور اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ

ہجرت کرکے دوسرے ملک میں نہیں جائیں اور ہندوستان ہی میں رہیں کہ جہاں انہیں مذہبی امور کی آزادی ہے۔ لیکن کچھ علماء کی تعداد ایسی تھی کہ جنہوں نے اس چیز کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ ان کا رابطہ انگریزوں سے نہ ہو جائے۔ ہندوستان سے حجاز ہجرت کرلی اور وہاں پر ہی مستقل سکونت اختیار کرلی۔ جو علماء حجاز نہیں جاسکے انہوں نے مسلمان ریاستوں میں بود و باش کو ترجیح دی تاکہ اس طرح وہ کم از کم انگریزوں سے دور رہیں گے۔

اس طرح علماء نے تو اپنے لئے کوئی نہ کوئی حل نکال لیا' ان میں سے وہ جنہوں نے ہندوستان کو دارالامن تسلیم کرلیا تھا'' انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمتیں بھی قبول کرلیں لیکن مسئلہ عام مسلمانوں کا تھا کہ وہ ان میں سے کون سی بات کو تسلیم کریں۔ بہرحال ایک چیز تو واضح تھی اور وہ یہ کہ تمام مسلمانوں کے لئے ناممکن تھا کہ وہ ہجرت کرکے کسی دوسرے ملک چلے جائیں۔ ان پر یہ بات بھی واضح تھی کہ انگریزوں کی فوجی طاقت اس قدر زیادہ ہے کہ ان سے لڑ کر انہیں یہاں سے نکالنا بھی اب ناممکن ہو گیا تھا۔ مغل سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے بعد' ان کے لئے ملازمتوں کا حصول بھی مشکل ہو گیا تھا۔ لہٰذا اب ملازمتوں کی تلاش میں ہندو اور مسلمان دونوں کمپنی اور مقامی ریاستوں کی جانب رجوع کر رہے تھے۔ ان سارے عمل میں مذہبی شناخت انتہائی کمزور ہو گئی تھی کیونکہ مسلمان فوجیوں کو اگر ہندو راجہ کے ملازمت ملتی تو وہ اختیار کرنے پر مجبور تھا اور اگر اسے ہم مذہبوں سے جنگ بھی کرنا پڑے تو اس کے لئے اس میں کوئی جھجک نہیں رہی تھی۔

علماء کے لئے یہ صورت حال ضرور تشویش ناک تھی کہ اگر معاشرے میں اس

طرح سے اشتراک ہو جائے گا تو مسلمانوں کی علیحدہ سے کوئی مذہبی شناخت نہیں رہے گی' ان حالات میں شاہ عبدالعزیز دہلوی نے کئی فتوے جاری کئے۔ مثلاً انہوں نے مسلمانوں کو اس بات کی اجازت دی کہ وہ کافروں کی ملازمت کریں مگر بحیثیت فوجی کے نہیں تاکہ انہیں مسلمانوں سے جنگ نہ کرنی پڑے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ دوسرے عہدوں اور حیثیتوں میں ان کی ملازمت کرنے میں کوئی حرج نہیں اور ایک مرتبہ جب ملازمت کر لیں تو پھر ان کی وفاداری بھی لازمی ہے۔ لیکن انہیں اس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ ان کے کافروں کے ساتھ سماجی اور ثقافتی تعلقات نہ ہوں۔ یہاں تک کہ وہ برتن کہ جو کافر استعمال کرتے ہوں ان کو ہاتھ نہ لگایا جائے' اگر بہت ہی ضروری ہو تو ان برتنوں کو اچھی طرح سے دھو کر صاف کیا جائے' پھر ان میں کھایا' پیا جائے۔ اس طرح سے انہوں نے اس بات کی بھی سخت مخالفت کی کہ کافروں کے تہواروں اور تقریبات میں شامل ہوا جائے' ان کی عبادت گاہوں میں جایا جائے۔

شاہ عبدالعزیز نے اس بات کی بھی اجازت دے دی تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کو اختیار کر لیا جائے' بلکہ انہوں نے اپنے بھتیجے عبدالحئ کو کمپنی کی ملازمت کرنے دی۔ اگرچہ اس خبر کو سن کر اس وقت کے مشہور صوفی شاہ غلام علی نے سخت افسوس کا اظہار کیا تھا۔ اس پر عبدالعزیز نے ایک خط میں اپنے فیصلہ کو صحیح ثابت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس قسم کی ملازمت میں نہ تو اس بات کا خطرہ ہے کہ کافروں کے ساتھ تعلقات بڑھیں گے' نہ ہی ان کی خوشامد کرنا ہو گی۔ نہ جھوٹ بولنا پڑے گا' اور نہ ہی اسلام کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جائے گا۔

انہوں نے مسلمانوں کو اس بات کی بھی اجازت دے دی تھی کہ وہ انگریزی سیکھ

سکتے ہیں، مگر ساتھ ہی میں ان کی ہدایت کی تھی کہ اس زبان کو سیکھ کر نہ تو وہ

انگریزوں کی خوشامد کریں اور نہ اس کے ذریعہ ذاتی مفادات کو حاصل کریں۔

لیکن ان تمام شرائط کے ساتھ بار بار مسلمانوں سے یہ کہا گیا کہ وہ انگریزوں سے دور رہیں، ان سے اپنے تعلقات کو نہ بڑھائیں اور نہ ہی ان کے طور طریق، لباس، اور عادات کو اختیار کریں۔ چنانچہ ان فتووں اور عام رجحانات کی وجہ سے لوگوں کی اکثریت انگریزوں سے ملنے سے پرہیز کرتی تھی اور اگر اپنے معاملات کی وجہ سے ملنا ہی پڑتا تھا، تو ملاقات مختصر ہوتی تھی اور اکثر لوگ تو مصافحہ کے بعد ہاتھ دھو لیا کرتے تھے، اور جن لوگوں کے انگریزوں سے دوستانہ تعلقات تھے، جنہوں نے تھوڑی بہت انگریزی طور طریق اختیار کر لئے تھے، انہیں معاشرہ میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور ایسا سمجھا جاتا تھا کہ اس نے اپنے معاشرہ کی توہین کی ہو۔ مثلاً جب محسن الملک نے سرسید احمد خاں کو چھری کانٹے کے ساتھ میز پر، انگریزوں کی طرح کھاتے ہوئے دیکھا تو انہیں اس سے زبردست صدمہ ہوا، اور اپنے اس صدمہ پر قابو پانے میں انہیں کافی وقت لگا۔

اس وجہ سے علماء کے برعکس سرسید نے اس مہم کو چلایا کہ وہ مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ یورپی طرز زندگی اختیار کرنا اسلام کے خلاف نہیں۔ اس لئے اس کو اختیار کر کے انگریزوں کے ساتھ تعلقات کو بڑھایا جائے، کیونکہ جب تک یورپی تہذیب کو اختیار نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک انگریزی ذہن کو نہیں سمجھا جا سکے گا، اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق، میں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ اہل کتاب کے ساتھ کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایک تو نئی تعلیم کی وجہ سے اور بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے آہستہ آہستہ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقوں میں یورپی تہذیب و

تمدن مقبول ہوتا چلا گیا' اور اس کے ساتھ ہی یورپی تعلیم یافتہ طبقوں نے مسلمانوں کی راہنمائی کا دعویٰ کر دیا۔ اس کے بعد سے علماء اور ان میں راہنمائی کے لئے ایک کش مکش شروع ہو گئی۔ اس کش مکش میں فیصلہ اس بات پر ہونا تھا کہ کون بدلتے ہوئے حالات کو بہتر سمجھتا ہے' اور ان کا عملی حل پیش کرتا ہے؟

مذہبی تحریکیں

مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سے سب سے اہم سبب علماء کے نزدیک یہ تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں بہت سی ہندووانہ رسومات آ گئیں تھیں' لہٰذا زوال کے اس عمل کو روکنے کے لئے ضروری تھا کہ اسلام کو ان رسومات سے پاک کیا جائے اور خالص اسلامی تعلیمات کو فروغ دیا جائے۔ صرف اسی صورت میں مسلمان اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لئے علماء کی ابتدائی نو آبادیاتی دور میں جو تحریکیں شروع ہوئیں ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ ثقافت جو ہندو مسلم اشتراک سے پیدا ہو رہی ہے اسے روکا جائے اور مسلمانوں میں مذہبی بنیاد پر علیحدہ سے شناخت کو ابھارا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے نو آبادیاتی دور کے مسائل سے مقابلہ کرنے کے بجائے اول تو ہندو اثرات کے خلاف تحریک شروع کی' جو بعد میں ذہنی جنگ کے ساتھ ساتھ جسمانی جنگ میں بدل گئی۔

بنگال میں فرائضی تحریک اس کی ایک مثال ہے' اس کے بانی حاجی شریعت اللہ (وفات۔ ۱۸۴۰) تھے' جنہوں نے ان پڑھ کسانوں میں کام کرنا شروع کیا اور ان کو اس پر تیار کیا کہ وہ اسلامی فرائض کو ادا کریں۔ کسانوں میں ان کے پیغام کو اس لئے سنا گیا کہ وہ ہندو زمینداروں کے ہاتھوں استحصال کا شکار تھے' اور کسی ایسے راستے کی

تلاش میں تھے کہ جو انہیں ان کے مظالم سے نجات دلائے۔ حاجی شریعت اللہ نے ان کو منظم کرکے ان میں ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا۔ ان کے کام کا طریقہ کار یہ تھا کہ اپنے ماننے والوں کی ایک برادری بنائی اور ان کا لباس بھی علیحدہ سے تجویز کیا تاکہ اس طرح سے ان میں یک جہتی اور اتحاد کا احساس ہو۔ اس کے بعد انہوں نے علاقہ کو مختلف حصوں میں بانٹ کر وہاں اپنے خلیفہ متعین کئے۔ گاؤں میں اپنی عدالتیں قائم کیں تاکہ مسلمان باہمی جھگڑوں کا فیصلہ یہاں پر کریں اور برطانوی عدالتوں میں جانے سے گریز کریں۔ کسانوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے انہوں نے زمین کے ٹیکس کو غیر قانونی قرار دے دیا۔

ان کی وفات کے بعد جماعت کی راہنمائی ان کے لڑکے دو دو میاں (وفات۔ ۱۸۶۲) کو ملی۔ انہوں نے تحریک کے فوجی عنصر کو ختم کرکے اسے مذہبی تحریک میں بدل دیا۔ یہ تحریک اگرچہ نو آبادیاتی دور میں شروع ہوئی مگر اس نے نو آبادیاتی نظام کے مسائل سے ہٹ کر اس بات پر زور دیا کہ مسلمان اپنی مذہبی شناخت کو مستحکم کریں اس کے نتیجہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات پیدا ہو گئے کہ جس کا فائدہ انگریزوں کو ہوا۔

اسی قسم کی ایک اور تحریک مغربی بنگال میں شروع ہوئی جسے تیتو میر (وفات۔ ۱۸۳۱) جو سید احمد شہید کے ایک مرید تھے' انہوں نے شروع کی' یہاں بھی انہیں مسلمان کسانوں کی حمایت حاصل ہو گئی کہ جو ہندو زمینداروں کے ہاتھوں پریشان تھے ان میں اتحاد برقرار رکھنے اور اپنی شناخت کا احساس بیدار کرنے کے لئے انہوں نے بھی حاجی شریعت اللہ کے طریقوں کو اپنایا' اور اپنے مریدوں کو علیحدہ سے لباس پہننے پر زور دیا تاکہ وہ خود کو ہندوؤں سے علیحدہ کر سکیں۔ تحریک کا جھگڑا بہت جلد ہندو

زمینداروں سے ہو گیا کہ جس نے ان کے لئے لاقانونیت کی شکل پیدا کر دی اور انہوں نے برطانوی حکومت کی حمایت سے اسے کچل کر ختم کر دیا۔

تیسری تحریک سید احمد شہید کی تھی جو کہ شروع تو شمال ہندوستان سے ہوئی' مگر اپنی سرگرمیوں کو انہوں نے سرحد کے علاقہ میں منتقل کر دیا جہاں یہ سکھوں اور پٹھانوں سے لڑے' اور بالاخر بالاکوٹ کے مقام پر سید احمد شہید کی شکست نے اس کی فوجی سرگرمیوں کو ختم کر دیا۔

یہ تینوں تحریکیں اصلاحی تھیں اور ساتھ میں فوجی قوت و طاقت سے اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا چاہتی تھیں۔ مذہب کو ہندووانہ رسومات سے پاک کرنے کی مہم مین انہوں نے نہ صرف مسلمانوں میں اختلافات پیدا کئے بلکہ اپنی قوت و طاقت اور نفرت کو ہندوؤں کے خلاف کر دیا اور انگریزوں کو اس کش مکش میں بالکل چھوڑ دیا۔ انہوں نے اس کا اندازہ نہیں لگایا کہ ہندوستان میں مسلمان جماعت کی کیا طاقت ہے۔ مشترکہ ثقافت کی جڑیں کتنی گہری ہیں اور اہل برطانیہ جو مقامی حمایتی گروہوں کے سہارے اقتدار حاصل کر رہے ہیں اس کو کس طرح سے روکا جائے۔ ان تینوں تحریکوں کی ناکامی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد' مسلمانوں کے لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ فوجی قوت کے سہارے دوبارہ سے سیاسی طاقت کو حاصل کر سکیں۔

لہٰذا ۱۸۵۷ء کے بعد اصلاحی تحریکوں کے ڈھانچہ میں زبردست تبدیلی آئی اور انہوں نے فوجی طاقت کے بجائے ایسے نظریات و خیالات کو پھیلانے کے لئے تعلیم کو استعمال کرنا شروع کیا۔ دیو بند مدرسہ کا قیام اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا کہ جس میں تعلیم کے ذریعہ مذہبی عقائد کو دوبارہ سے نئی زندگی دینے کی کوشش کی گئی۔

ان اصلاحی تحریکوں کی مخالفت میں احمد رضا خاں (وفات ۱۹۲۱) نے ایک مہم

شروع کی اور انی اس مہم میں انہوں نے ان تمام روایات' رسم و رواج' اور عقائد کی حمایت کی جو کہ وقت کے ساتھ عام مسلمانوں میں رائج ہو گئے تھے اور اب ان کے مذہب کا ایک حصہ ہو گئے تھے' ان کے خیال میں انہیں ان سے محروم کرنا ان کی زندگی میں خلا پیدا کرنا تھا' لہٰذا انہوں نے خالص اور اصلاحی مذہب کی سخت مخالفت کی" اور اپنے عقائد میں رسولؐ اللہ کی شخصیت کو مرکزی مقام دے کر اس کے گرد ساری تحریک کو متعین کر دیا۔ وہ سیدوں کی بھی اس لحاظ سے بہت زیادہ عزت کرتے تھے کیونکہ وہ رسولؐ اللہ کی اولاد تھے۔ وہ صوفیا کے معتقد تھے' اور اس پر یقین رکھتے تھے کہ ان سے مدد کے لئے کہا جائے اور دینی و دنیوی مسائل کے لئے ان سے رجوع کیا جائے۔ مزاروں کی زیارت کی جائے' منتیں مانی جائیں اور نذر و نیاز چڑھائی جائیں۔ اس طرح انہوں نے کوشش کی کہ ان کے زمانہ میں اسلام کی جو ارتقائی شکل موجود ہے اسے برقرار رکھا جائے۔ انہوں نے اس پالیسی کو بھی اختیار کیا کہ سیاست سے دور رہا جائے اور اپنی تمام توانائی کو صرف مذہبی امور تک محدود رکھا جائے۔

ان تحریکوں کے اثرات مختلف ہوئے۔ مثلاً دیو بند تحریک نے تعلیم یافتہ متوسط' شہری طبقوں کو متاثر کیا۔ جب کہ بریلوی عقائد ان پڑھ' اور دیہاتی علاقوں میں زیادہ مقبول ہوئے' لیکن ان مذہبی تحریکوں کا اثر یہ ہوا کہ اب ہر سیاسی و سماجی اور معاشی مسئلہ مذہب کی روشنی میں دیکھا جانے لگا' جس کی وجہ سے اس مسئلہ کے حل میں رکاوٹ پیدا ہونے لگی اور اس نے جدیدیت کے خلاف دفاعی محاذ بنا لیا۔

ان تحریکوں میں جو باہمی جھگڑے' اور فسادات ہونا شروع ہوئے' اس نے بھی مسلمانوں کی توجہ جدید سیاسی مسائل سے ہٹا کر مذہب پر مرکوز کر دی کیونکہ ہر مذہبی جماعت نے شدت کی پالیسی کو اختیار کرتے ہوئے' ایک دوسرے کو گمراہ اور کافر کہنا

شروع کر دیا' تاکہ ان کے حمایتوں میں ان کی کوئی عزت نہیں رہے۔ اس طرح مسلمانوں کو متحد کرنے کے بجائے انہوں نے مسلمانوں کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے آخر یہ مختلف مذہبی جماعتیں کیوں ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہیں تھیں؟ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی ہر جماعت اس بات کی خواہش مند تھی کہ وہ اپنے پیروکاروں کو متحد رکھے' اور انہیں جماعت چھوڑ کر نہ جانے دے اس لئے انہوں نے ان میں جماعت کی شناخت کو بیدار کیا اور اپنے ماننے والوں پر یہ پابندی لگا دی کہ وہ دوسری مذہبی جماعت کے لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں رکھیں گے' ان سے سلام دعا نہیں کریں گے' نہ ان کے ساتھ کھائیں گے اور نہ ان میں شادی بیاہ کریں گے۔

اس کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ ان میں سے ہر جماعت اس بات کا دعویٰ کرتی تھی کہ وہ مسلمانوں کی اکثریت کی نمائندہ ہے' اس لئے اگر ان کی جماعت کو کمزور کیا گیا یا اس کے خلاف کوئی سازش کی گئی تو یہ اسلام اور مسلم امہ کے خلاف سازش ہو گی' جو کہ ایک بڑا گناہ ہے۔

دراصل مغل سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے بعد' مسلمان جس طرح سے کمزور ہوئے تھے' اس کا واحد علاج یہ ڈھونڈا جا رہا تھا کہ انہیں متحد کیا جائے اور ان کے اختلافات کو ختم کر کے ان میں اتفاق کو پیدا کیا جائے' اس لئے ہر مذہبی جماعت نے اس کا دعویٰ کیا کہ وہ واحد جماعت ہے جو مسلمانوں کو متحد کرے گی' اور دوسری تمام جماعتیں اختلافات پیدا کرنے والی ہیں اس لئے ہر جماعت اس مہم میں مصروف ہو گئی کہ اتحاد کی خاطر دوسری جماعتوں کو ختم کر دیا جائے تاکہ صرف ایک جماعت اور اس کے عقائد پر پوری قوم کو ایک کیا جا سکے۔ جب ان کی کوششوں میں رکاوٹیں

آئیں تو انہوں نے مخالف جماعتوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا' اور اس طرح انہیں

اسلام کا دشمن گردانا۔

ایک وجہ ان مذہبی جماعتوں کی مخالفت کی یہ تھی' کہ ان سب کا دارومدار لوگوں کے چندوں پر تھا' اس لئے انہیں یہ خطرہ رہتا تھا کہ اگر ان کے پیروکار کم ہو گئے یا چھوڑ کر چلے گئے تو ان کے مالی وسائل پر اس کا اثر پڑے گا۔ اس لئے انہوں نے غیر دوستانہ اور مخالفانہ رویہ کو اختیار کیا تاکہ ان کا علیحدہ سے وجود برقرار رہے۔

اپنے عقائد اور نظریات کی تبلیغ کے لئے ان مذہبی جماعتوں نے اپنے اپنے دینی مدارس قائم کئے تاکہ ان میں متشدد طالب علم اور اساتذہ کی تربیت کی جائے' لہٰذا ان مدرسوں میں فرنگی محل' دیوبند' ندوۃ العلماء' اور مدرسہ مظاہر العلوم خاص طور سے قابل ذکر ہیں کہ جنہوں نے ایک دوسرے سے مختلف مذہبی نظریات کو پھیلایا۔ ان کی اس تقلید میں ہندوستان کے مشہور شہروں میں بھی مدرسوں کا قیام عمل میں آیا جن میں لاہور' مراد آباد' رامپور' بدایوں' جبل پور' بریلی' مارہرہ' پٹنہ' کراچی' اور کلکتہ شامل ہیں۔ ان مدرسوں کے قیام میں مسلمان امراء اور جاگیرداروں نے مالی طور پر مدد کی' جس کی وجہ سے یہ مدرسے کام کر سکے۔

چندے پر انحصار کی وجہ سے علماء کے ذاتی کردار اور ان کی تعلیم و تبلیغ پر بہت زیادہ اثر پڑا' چونکہ چندہ دینے والوں کی اکثریت خوش حال اور دولت مند مسلمان تھے اس لئے علماء نے سماجی مسائل کو نہیں چھیڑا' اور غربت' مفلسی' بھوک' صحت' اور نا انصافیاں ان کے دائرے کار میں نہیں آئیں۔ اس کے برعکس انہوں نے معاشرہ کے ڈھانچہ کو اسی طرح برقرار رہنے پر زور دیا اور ہر تبدیلی کی مخالفت کی۔

چندوں پر انحصار کرنے کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ علماء کا سماجی مرتبہ گھٹ گیا'

اگرچہ ان کی مذہبی حیثیت تو باقی رہیں، مگر ان کی عزت کم ہو گئی۔

مذہبی تنظیمیں

ہندوستان میں نو آبادیاتی دور میں سیاسی و سماجی اور مذہبی جماعتوں کی تنظیم کا آغاز ہوا، اور جب عیسائی مشنری جماعتیں تبلیغ کی غرض سے آئیں تو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے ان سے تنظیمی امور کے بارے میں بہت کچھ سیکھا، اور جب انہوں نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے اور اپنے اپنے مذہب کا دفاع کرنے کے لئے جماعتیں بنائیں تو ان کا ڈھانچہ اور تنظیم ان ہی مشنری جماعتوں کے مطابق رکھی۔

مثلاً کسی بھی جماعت کے لئے اولین طور پر یہ لازمی تھا کہ اس کا کوئی منشور ہو جو اس تنظیم کو قانونی شکل دے سکے۔ پھر حکومت نے ہر جماعت کے لئے یہ لازمی قرار دیا تھا کہ اسے رجسٹرڈ کرایا جائے، اس طرح یہ جماعتیں قانونی ہو جاتی تھیں۔ پھر ان جماعتوں کو چلانے کے لئے اس کے باقاعدہ سے عہدے دار ہوتے تھے ان میں صدر، جنرل سیکرٹری، خزانچی اہم عہدے ہوتے تھے، اور باقی اراکین یا مجلس مشاورت ہوتی تھی، جو کہ جماعت کی پالیسی کو طے کرتی تھی۔ جماعت کے مالی امور کے بارے میں ریکارڈ رکھا جاتا تھا اور اس کی تفصیل دی جاتی تھی کہ کتنے پیسے وصول ہوئے، اور کتنے خرچ ہوئے، پالیسی معاملات کے لئے اراکین کی پابندی سے میٹنگیں ہوا کرتی تھیں اور ایک اجلاس سالانہ ہوتا تھا جس میں سال بھر کی سرگرمیوں کی تفصیل دی جاتی تھی اور حساب کتاب پیش کیا جاتا تھا۔

جماعتوں کے اس ریکارڈ کا فائدہ یہ ہوا کہ ہر جماعت کی تاریخ بنتی گئی اور اراکین و عام لوگوں کے علم میں یہ بات آتی رہی کہ جماعت کیا کر رہی ہے، اور اس نے اب

تک کیا حاصل کیا ہے؟ اگرچہ یہ ضرور ہوا کہ بہت سی جماعتوں نے اپنے ریکارڈ کو پوری طرح سے محفوظ نہیں رکھا' اور سستی و کاہلی' جماعت میں لیڈروں کی تبدیلی نے بہت ریکارڈ ضائع کرا دیا' مگر اس کے باوجود جو تھوڑا بہت ریکارڈ محفوظ رہا اس سے اس عہد کے بارے میں بہت سی معمولی مگر اہم معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

علماء نے جب اپنی اپنی جماعتیں بنائیں' تو ایسے منصوبوں کو پورا کرنے' اور اپنے منشور پر عمل درآمد کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ عوام سے اپیل کر کے چندہ جمع کریں' چنانچہ جن جماعتوں کو زیادہ چندہ ملا انہوں نے اپنے پیسے سے اپنے لئے جائدادیں خریدیں' جماعت کا آفس' مدرسہ کی تعمیر' اور یتیم خانوں کا سلسلہ اس سے شروع ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کی ایک پیشہ ور جماعت وجود میں آ گئی کہ جس نے معاشرے میں ان رفاہی کاموں کو اپنے ذمہ لے لیا اور چندوں کی وصول یابی نے خود ان کی مالی حالت کو بہتر بنا دیا۔ ان میں سے کچھ جماعتوں اور تنظیموں نے اچھا کام کیا مگر اکثر کے بارے میں یہ شکایات ہیں کہ انہوں نے پیسے کھا لئے اور بدعنوانیوں اور غبن کے بعد ان تنظیموں کا خاتمہ ہو گیا۔

ایک طرف تو علماء کی شناخت مسجد' مدرسہ' اور رفاہی مذہبی اداروں سے تھی مگر جب برصغیر میں سیاسی سرگرمیاں شروع ہوئیں اور سیاسی جماعتیں سرگرم عمل ہوئیں تو اس وقت علماء نے بھی اس ضرورت کو محسوس کیا کہ وہ خود کو محض مذہبی تنظیموں تک محدود نہیں رکھیں' بلکہ سیاست میں بھی حصہ لیں' اور اس طرح سے اپنا سماجی رتبہ بھی بلند کریں۔ علماء کے ان اداروں اور خواہشات کو مولانا شبلی نعمانی نے اپنی ایک تقریر میں اس طرح سے بیان کیا ہے:

"معزز حضرات! مسلمان دور حکومت میں دنیاوی اور مذہبی معاملات علماء کے

ہاتھوں میں تھے۔ علماء نماز اور روزہ کے مسائل کے ساتھ ساتھ عدالتی مقدمات کے فیصلے بھی سناتے تھے' وہ مجرموں کو سزائیں دیتے اور احکامات صادر کرتے تھے' سزائے موت یا قصاص کے فیصلے بھی وہی سناتے تھے۔ مختصراً" یہ کہ دنیاوی اور دینوی دونوں معاملات انہیں کے ہاتھوں میں تھے۔ اب صورت حال بدل گئی ہے اور دنیاوی امور برطانوی حکومت کے ماتحت ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ علماء اور مسلمانوں کی جماعت کے رشتہ اور روابط کس قسم کے ہوں' اور انہیں حکومت سے کون سے معاملات لینا چاہئیں' اور کون سے اس کے سپرد کرنا چاہئیں' اور کون سی ایسی باتیں ہیں کہ جن میں حکومت کو مطلق دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے"۔

لہٰذا علماء سیاست میں عملی طور پر اس لئے حصہ لینا چاہتے تھے کہ برطانوی دور حکومت سے پہلے ان کے جو اختیارات تھے انہیں دوبارہ سے حاصل کیا جائے' اور اپنی سرگرمیوں کو صرف مذہبی معاملات تک محدود نہیں رکھا جائے بلکہ اس سے اور آگے بڑھ کر دنیاوی امور میں بھی ان کی راہنمائی کی جائے' اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ نئے سیاسی ڈھانچہ میں' اپنی مذہبی و سیاسی جماعتیں بنائی جائیں اور اس پلیٹ فارم سے اپنے مطالبات کے لئے جدوجہد کی جائے' اسی قسم کی ایک جماعت جو علماء نے بنائی اس کا نام مجلس معرید الاسلام تھا' جس کے قیام میں فرنگی محل کے علماء پیش پیش تھے' اور جس کا مقصد شریعت کا قیام اور مسلمانوں کی ترقی تھا۔

اس کے بعد ہی دوسرے مذہبی فرقوں کی جانب سے بھی جماعتیں بننا شروع ہو گئیں کیونکہ ہر فرقہ کے مذہبی عقائد مختلف تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ایک جماعت تمام فرقوں کی نمائندگی کرتے ہوئے مطالبات پیش کرے۔ اس لئے ۱۹۰۷ء میں

شیعوں نے آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے نام سے اپنی تنظیم کا اعلان کیا۔ ۱۹۱۴ء میں سنی علماء نے جمیعتہ الہند کے نام سے جماعت بنائی۔ ابتداء میں اس کا مقصد یہ تھا کہ یورپی حملوں کی وجہ سے خلافت اور مقدس مقامات کو جو خطرہ ہو گیا تھا' اس کے خلاف جدوجہد کی جائے اور خلافت کے عہدے کو برقرار رکھا جائے۔

علماء نے ابتداء میں سیاسی جماعتوں سے کوئی روابط نہیں رکھے' اور خصوصیت سے ایسی سیاسی پارٹیوں سے جن میں ہر مذہب اور مسلک کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر ان پارٹیوں کے اجلاس میں شرکت کی جائے گی تو انہیں غیر مسلم خواتین کے ساتھ بیٹھنا پڑے گا' اور اجلاس کے دوران انہیں اس کا موقع نہیں ملے گا کہ وہ نماز ادا کر سکیں۔

اس موقع پر ابوالکلام آزاد نے جو کہ اپنے ہم عصر علماء کی تنگ نظری' کم علمی اور تشدد سے بے زار تھے' اس بات کی کوشش کی انہیں نئے سیاسی ماحول میں ایسی تربیت دی جائے کہ جس کے بعد وہ اس قابل ہو سکیں کہ سیاست میں حصہ لیں' اور بدلتے ہوئے حالات اور نئے پیدا ہونے والے مسائل کو سمجھ سکیں۔ آزاد اس وجہ سے علماء کو سیاست میں لانا چاہتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں مسلمان صرف مذہب کے نام ہی پر متحد ہو سکتے ہیں اور انہیں مذہب کے ذریعہ ہی سیاسی طور پر سرگرم بنایا جا سکتا ہے' چنانچہ اس نظریہ کے تحت انہوں نے حزب اللہ کے نام سے ایک جماعت بنائی' تاکہ علماء کو اس کے ذریعہ تربیت دے کر باعمل بنایا جائے۔

اس سارے عمل کے پیچھے آزاد کی یہ فکر تھی کہ مذہب اور سیاست ایک ہیں' انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا' لہٰذا سیاسی فہم کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تشریح مذہب کے ذریعہ کی جائے' اور یہ فیصلہ علماء کریں کہ کون سا سیاسی اقدام

مذہب کے مطابق ہے۔

۱۹۱۴ء میں انہوں نے مدرسہ دارالارشاد قائم کیا تاکہ نوجوان علماء کو اپنے خیالات کے مطابق ڈھالا جائے۔

علماء کی ان تنظیموں کا اثر یہ ہوا کہ' ان کا طبقہ بہت جلد برصغیر کی سیاسی تحریکوں میں باعمل ہو گیا' کانگریس اور مسلم لیگ دونوں میں علماء کی شمولیت ضروری ہو گئی تا کہ ان کے ذریعہ سے مسلمان عوام کی حمایت حاصل کی جائے۔

علماء اور خلافت

جب مسلمانوں میں یورپی تعلیم یافتہ طبقہ ابھرا' تو انہوں نے بھی ہندو تعلیم یافتہ طبقہ کی پیروی کرتے ہوئے' اپنے سیاسی حقوق کی بات کرنا شروع کر دی' اور کانگریس کے مقابلہ میں اپنی سیاسی جماعت مسلم لیگ کی داغ بیل ڈالی۔ اس طرح سے مسلمانوں میں سیاست و مذہب دو علیحدہ علیحدہ چیزیں رہیں۔ سیاسی راہنمائی کی ذمہ داری نئے تعلیم یافتہ طبقے نے اٹھا لی' جب کہ علماء مذہبی امور اور مسئلہ مسائل کے ذمہ دار رہے۔ اس لئے ابتداء میں جو بھی سیاسی مسائل تھے جیسے کہ اردو ہندی جھگڑا' بنگال کی تقسیم' شملہ' وفد اور مسلم لیگ کا قیام' ان سب میں علماء کو دور رکھا گیا اور مسلمانوں کی سیاسی لیڈرشپ نے ان مسائل کو خالص سیاسی اور اپنے طبقاتی مفادات کی روشنی میں دیکھا اور ان کا حل نکالا۔

لیکن یہ صورت حال اس وقت بدلی جب ۱۴-۱۹۱۲ء میں بلقان کی جنگیں ہوئیں اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے مقدس مقامات کے تحفظ اور خلافت کے ادارے کو بچانے کے سوالات سامنے آئے' اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے سیکولر اور مذہبی


راہنما ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے' اور اس نے علماء کو یہ موقع فراہم کیا

کہ وہ سیاست پر اثر انداز ہوں۔

جب خلافت کا مسئلہ ہندوستان کی مسلم سیاست میں ابھر کر آیا تو اس مسئلہ کی مذہبی نوعیت کی وجہ سے سیکولر لیڈر شپ نے علماء کو دعوت دی کہ وہ ان کے ساتھ تعاون کریں تا کہ برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالا جائے کہ ترکی میں خلافت کو باقی رکھے' ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کے اجلاس میں ڈاکٹر انصاری نے ہندوستان کے سربرآوردہ علماء کو دعوت دی کہ وہ اس اجلاس میں شرکت کریں اور خلافت کے مسئلہ پر ایک متحدہ پالیسی کو اختیار کریں۔ اس دعوت نے علماء میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا' مولانا کفایت اللہ' مولانا عبدالباری' مولانا احمد سعید اور مولانا آزاد سبحانی نے اس میں شرکت کی۔ علماء کو اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ یورپی تعلیم یافتہ طبقہ کے ساتھ کام کرنے' اور ان کے ساتھ تعاون کے بعد معاشرے میں ان کا سماجی اور سیاسی رتبہ بڑھ جائے گا' اور مسلمان جماعت کی راہنمائی کے مواقع انہیں اور زیادہ مل جائیں گے۔ اسی چیز کو ذہن میں رکھتے ہوئے مولانا کفایت اللہ نے کہا کہ:

میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ مسلمانوں میں سیاست اور مذہب ہمیشہ سے ایک رہے ہیں' اور درحقیقت ان کا مذہب ہی ان کی سیاست اور ان کی سیاست مذہب ہے' بدلتے ہوئے حالات میں انہوں نے اپنے مذہب کو علماء کے حوالہ کر دیا تھا' اور سیاست کو مسلم لیگ اور اس قسم کی سیاسی جماعتوں سے منسلک کر دیا تھا' لیکن جب علماء کی ضرورت پڑی اور انہیں آواز دی گئی تو وہ کھلے دل اور خوشی سے آئے کہ ان کے ساتھ اتحاد کریں اور سیاسی جماعت میں شامل ہوں"۔

ایک دوسرے عالم محی الدین نے کہا کہ: "اب تک علماء مذہب اور مسلمانوں کی سیاست کو دو مختلف چیزیں سمجھتے تھے' لیکن دیکھا جائے تو اسلام میں یہ دونوں ایک ہیں۔ مسلمانوں کی سیاست ان کا مذہب ہے"۔

اس نئی صورت حال میں سیکولر لیڈر شپ اس بات پر خوش تھی کہ علماء نے اس کے ساتھ تعاون کیا ہے اور اس سے ان کی طاقت میں اضافہ ہوا ہے' مگر انہیں میں چودھری خلیق الزماں نے علماء کے اشتراک اور اس کے نقصانات کو محسوس کر لیا تھا اور متنبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

وہ علماء کے ساتھ اشتراک کر کے درحقیقت آگ سے کھیل رہے ہیں' وہ یا تو ان کی ٹانگیں پکڑ کر کھینچ لیں گے' اور یا پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے ساتھ بہا لے جائیں گے"۔

آگے چل کر جب گاندھی نے خلافت تحریک کی حمایت کی تو یہ ایک عوامی جدوجہد بن گئی' اور اس سے بھی علماء نے فائدہ اٹھایا جو بطور مذہبی راہنما کے سب سے آگے آ گئے۔ حمزہ علوی نے اس پہلو کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنے مقالہ "پاکستان اور اسلام: نسل پرستی اور نظریہ" میں لکھا ہے کہ: اس طرح سے مسلمان تنخواہ دار طبقہ کو مسلمان عوام سے کاٹ دیا گیا اور اس کی جگہ مذہبی راہنماؤں یعنی علماء کو مسلمانوں کا سربراہ بنا دیا گیا' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ایک ایسے مسئلہ کے لئے ابھارا گیا کہ جس کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی اور جو اپنی موت آپ مرنے والا تھا۔ حمزہ علوی لکھتے ہیں کہ اس نے مسلم لیگ کو کمزور کر دیا' اور علماء کو سیاست میں لا کر انہیں علیحدہ سے اپنی پارٹی بنانے کا موقع دیا' جو انہوں نے ۱۹۱۹ء میں جمعیت علماء ہند کے نام سے قائم کی۔



سرگرم ہو گئے بلکہ ملکی سیاست کا ایک اہم عنصر بن گئے۔ سیاست اور مذہب کے اس ملاپ سے برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی ذہنیت بری طرح سے متاثر ہوئی اور ان میں سیاسی بوجھ' اور سیاسی معاملات کو سیاسی نقطہ نظر سے دیکھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی' وہ ہر مسئلہ کو سیاست کے بجائے مذہبی نقطہ نظر سے دیکھنے لگے۔ مثلاً جب خلافت کا مسئلہ اٹھا تو یہ مسلمانوں کے لئے خالص مذہبی تھا' مگر یہی مسئلہ ہندوؤں کے لئے سیاسی بن گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں مذہبیت بڑھی تو ہندوؤں میں سیاسی شعور گہرا ہوا۔ اس طرح مسلمان سیاسی طور پر پس ماندہ ہوتے چلے گئے اور ان میں بدلتے حالات میں سیاسی تبدیلیوں کی سوجھ بوجھ کمزور ہو گئی۔

علماء اور ہجرت

اس طرح خلافت تحریک نے علماء کو سیاسی میدان میں لا کھڑا کیا' اور انہوں نے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کر کے اپنے لئے معاشرہ میں ایک سیاسی مقام حاصل کر لیا۔ خصوصیت سے انہوں نے جہاد کے فتویٰ کو استعمال کر کے مسلمانوں کو مزید سرگرم بنا دیا۔ اسی قسم کا ایک فتویٰ جو "متحدہ فتویٰ" کہلاتا تھا' وہ علماء کی جانب سے جاری ہوا جس میں انہوں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ چونکہ انگریز خلافت کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور مقامات مقدسہ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں' اس لئے ان کے خلاف بائیکاٹ کرنا چاہیے اور ان کی کوششوں کو روکنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی علماء نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ برصغیر کے مسلمانوں کو شریعت کے ماتحت کیا جائے' اس مقصد کے لئے انہوں نے شرعی عدالتیں قائم کرنا شروع کر دیں' اور زکوٰۃ کی وصولی کا بھی انتظام کرنا

شروع کر دیا۔

سندھ میں بھی کچھ علماء نے اس قسم کا ایک فتویٰ شائع کیا کہ جس میں مسلمانوں پر زور دیا کہ اگر ان کو حکومت کی جانب سے خطاب ملے ہوں تو انہیں واپس کر دیں' اور حکومت سے کسی قسم کا تعاون نہیں کریں کیونکہ عیسائی مسلمانوں کے مقدس مقامات پر سوروں کو مارتے ہیں' جوتوں سمیت چلتے ہیں' سگرٹ پیتے ہیں' شراب کا استعمال کرتے ہیں۔ علماء نے مسجدوں کو اپنے پروپیگنڈے کا ذریعہ بنایا' اور وہاں سے عیسائیوں کے اور حکومت و عظوں کا سلسلہ شروع کیا اور مسلمانوں سے کہا کہ وہ ان سے جہاد کے لئے تیار ہو جائیں۔

ان حالات میں مسلمان پوری طرح سے علماء کی گرفت میں آ گئے' اس کا تجزیہ کرتے ہوئے بی۔ آر۔ نندا نے اپنی کتاب "گاندھی: پان اسلام ازم' امپیریل ازم اینڈ نیشنل ازم" میں لکھا ہے کہ:

"تشدد پرستی اپنی بلندیوں پر پہنچ گئی اور ہر طرف قسم قسم کی افواہیں پھیلنے لگیں' کہ برطانوی ہندوستان میں قرآن شریف کی تعلیم پر پابندی لگنے والی ہے' یا مکہ و مدینہ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے اور کعبہ کو تباہ کر دیا گیا ہے' اور جمعہ کے بجائے اب اتوار کو مذہبی عبادت کا دن مقرر کیا جا رہا ہے"۔

لہٰذا ان حالات میں مسلمانوں کے لئے دو راستے تھے: یا تو وہ جہاد کریں اور یا ہندوستان سے ہجرت کر جائیں' ابو الکلام آزاد نے اس موقع پر ایک فتویٰ جاری کیا کہ جس میں ہجرت کا مشورہ دیا گیا ہے۔

"تمام دلائل شرعیہ' حالات حاضرہ' مصالح مہمہ امت' مقتضیات صالحہ و موثرہ

پر نظر ڈالنے کے بعد پوری بصیرت کے ساتھ اس اعتقاد پر مطمئن ہو گیا

ہوں کہ مسلمانان ہند کے لئے بغیر ہجرت کے کوئی شرعی چارہ نہیں۔ ان تمام مسلمانوں کے لئے جو اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا عمل انجام دینا چاہیں ضروری ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں"۔

اس فتویٰ کو مولانا عبدالباری فرنگی محل کی حمایت حاصل تھی اس فتویٰ کے نتیجہ میں تقریباً ہزاروں مسلمان ہجرت کر کے افغانستان گئے جن میں سے دس ہزار راستے کی صعوبتوں یا افغانستان کے قیام کے دوران مارے گئے' اور ہزاروں دیار غیر میں ذلیل و خوار ہوئے کہ جہاں افغان بھائیوں نے ان کے ساتھ ہر قسم کا سلوک روا رکھا۔ یہ ہجرت تحریک بغیر کسی فائدے کے ختم ہو گئی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہجرت کا موضوع ۱۹۴۷ء کے موقع پر پھر زیر بحث آیا' اور علماء نے اپنی کانگریس اور لیگ سے وابستگی کی بنیادوں پر اس مسئلہ پر بحث کی۔ جمعیت العلماء ہند کے مولانا حسین احمد مدنی نے بڑے جذباتی انداز میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ہجرت کر کے نہ جائیں اور اپنے پیچھے اپنے آباؤ اجداد کی قبریں' مسجدیں' تاریخی عمارات' اور ثقافتی ورثہ چھوڑ کر نہ جائیں' کیونکہ اگر ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہوا تو یہ تباہ ہو جائیں گی۔

اس کے برعکس مسلم لیگ کے مولانا شبیر احمد عثمانی نے ہجرت کے بارے میں یہ دلیل دی کہ رسول اللہ نے بھی ہجرت کی تھی' اور وہ بھی مکہ سے مدینہ جاتے ہوئے ہر چیز کو چھوڑ گئے تھے' لٰہذا ہندوستان کے مسلمانوں کو اس کی پیروی کرتے ہوئے ہجرت کرنا چاہیے اور پاکستان کو مدینہ بنانا چاہیے۔

پاکستان بننے کے بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء کو آزاد نے جامع مسجد دہلی میں خطابت سے

بھرپور ایک تقریر کی۔ جس میں انہوں نے ہجرت کے عمل کی زبردست مذمت کی" ان کی تقریر کا متن درج ذیل ہے:

میرے عزیزو! آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی چیز ہے' جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لئے شاہ جہان کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع کوئی نئی بات نہیں ہے میں نے اس زمانہ میں جس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں' تمہیں یہیں سے خطاب کیا تھا۔ جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا اور تمہارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد۔ آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں' تو مجھے بے اختیار پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آ جاتی ہیں۔ تمہیں یاد ہے' میں نے تمہیں پکارا تم نے میری زبان کاٹ لی' میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیئے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے' میں نے کروٹ لینی چاہی' تم نے میری کمر توڑ دی' حتیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ نواسیاست جو تمہیں آج داغ جدائی دے گئی ہے' اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا' لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا' بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کریں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ان ہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے' جن کا اندیشہ تمہیں صراط مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا' جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لئے چن لیا تھا' وہاں میرے بال و پر کاٹ

لئے گئے ہیں یا میرے آشیانے کے لئے جگہ نہیں رہی' بلکہ میں کہنا چاہتا

ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی' تم نے کونسی راہ اختیار کی۔ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں؟ کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آگیا ہے؟ یہ خوف تم نے خود ہی فراہم کیا ہے۔ یہ تمہارے اپنے اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا' جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لئے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے' اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے۔ نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ لیکن تم نے سنی ان سنی برابر کر دی' اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمہارے لئے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہیں بھروسہ تھا' وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے۔ وہ تقدیر جو تمہارے دماغی لغت کی منشاء سے مختلف مفہوم رکھتی ہے یعنی ان کے نزدیک فقدان ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی' اور راہنمائی کے وقت بت جو تم نے وضع کئے تھے' وہ بھی دغا دے گئے' حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھائی گئی ہے اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے۔ میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمہارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں لیکن اگر کچھ دور ماضی کی

طرف پلٹ جاؤ تو تمہارے لئے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا۔

"جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلو تہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا' تو مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا' ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا' جو صفحہ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ آج ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے"۔

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی' بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی اور یہی وہ انقلاب ہے' جس کی ایک کروٹ نے تمہیں بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی ہے اور اس کی جگہ بری شے آ گئی ہے۔ ہاں' تمہاری بیقراری اسی لئے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لئے تیار نہیں کیا تھا۔ اور بری شے کو ملجا و ماوئی سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے۔ جس کے ہاتھوں تم نے

مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا کہ جب

ہماری قوم کے قدم کسی جنگ کے آغاز کی طرف تھے اور آج تم اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمہاری اس عجلت پر کیا کہوں؟ کہ ادھر سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور ادھر گمراہی کا خطرہ بھی پیش آگیا!۔

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاست کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اس پرخار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لئے ہوتی ہیں لیکن مجھے آج جو کچھ کہنا ہے' اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں متحد ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی' اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے' جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بد قسمتی سے بعض مقامات میں آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

پچھلے سات برس کے روداد دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں ہی کا نتیجہ ہے لیکن میرے لئے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ میں پچھلے دنوں ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔

اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے مسلم لیگ کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے انداز فکر میں بھی سوچ سکتے ہیں یا نہیں۔ اسی لئے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتہ میں ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا

ہے۔ دعوت نامے بھیج دیئے گئے ہیں۔ ہراس کا موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔ میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو' شک سے ہاتھ اٹھالو' اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے' جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہے۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے' اس پر غور کرو' اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو' اور پھر دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟

یہ دیکھو' مسجد کے بلند مینار تم سے اچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصے پہلے تمہارا جوش و خروش بیجا تھا' اسی طرح آج یہ تمہارا خوف و ہراس بھی بیجا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال' ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمانوں کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے' اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں انہوں نے

تمہیں جانے کے لئے اکٹھا کیا تھا۔ آج انہوں نے تمہارے ہاتھ سے اپنا

ہاتھ کھینچ لیا ہے' تو یہ عیب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں' تو اسے خدا کی جلوہ گاہ بناؤ' جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امی کی معرفت فرمایا تھا۔ "جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لئے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم"۔ ہوائیں آتی ہیں اور گذر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی' لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ' جیسے تم پہلے کبھی اس حالت ہی میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں ہوں۔ لیکن مجھے تمہاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار یہ کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنی گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے جو ہونا تھا' وہ ہو کر رہا۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمہارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں' اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی' تو پھر حالت دوسری ہے لیکن اگر واقعی تمہارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے' تو پھر اس طرح بدلو' جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔ آج بھی کہ ہم ایک دور انقلاب کو پورا کر چکے ہیں' ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ان صفحوں میں زیب عنوان بن سکتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لئے تیار بھی ہوں۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے

بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو' جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو اجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں' وہ تمہارا ہی قافلہ تھا' انہیں بھلاؤ نہیں' انہیں چھوڑو نہیں' ان کے وارث بن کر رہو' اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لئے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے' ہم اس کے لئے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو' کبھی تم خود اک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو' کیا یاد نہیں کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا! یہ بادلوں نے میلا پانی برسایا ہے تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائینچے چڑھا لئے ہیں۔ وہ تمہارے ہی اسلاف تھے' جو سمندروں میں اتر گئے' پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا۔ بجلیاں آئیں' تو ان پر مسکرا دیئے۔ بادل گرجے' تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اٹھی' تو اس کا رخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں' تو ان سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے' آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے اور



عزیزو! میرے پاس تمہارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ وہی پرانا نسخہ ہے' جو برسوں پہلے کا ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔ وہ نسخہ ہے قرآن کا' یہ اعلان کہ **لا تھنوم ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔**

آج کی محبت ختم ہو گئی مجھے جو کچھ کہنا تھا' وہ اختصار کے ساتھ کہہ چکا ہوں پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں اپنے ہواس پر قابو رکھو' اپنے گرد و پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کر لادوں۔ یہ تو دل کی دکان ہی میں سے اعمال صالحہ کی نقدی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ

آزادی کے اس تقریر کو جو انہوں نے ۱۹۴۷ء میں کی' اور ان کے ۱۹۲۰ء کے فتویٰ کا مقابلہ کیجئے۔ ۱۹۲۰ء میں وہ ہر مسلمان کے لئے ہجرت کو لازمی قرار دے رہے ہیں اور اس وقت انہیں نہ تو ان کی تاریخی عمارتوں کی فکر ہے' نہ آباو اجداد کے مقبروں کی' نہ ان کے گھروں کی اور نہ ثقافتی ورثہ کی۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں اچانک یہ تمام باتیں یاد آ جاتی ہیں اور وہ مسلمانوں کو یاد دلاتے ہیں کہ ان کی حفاظت کے وہ ذمہ دار ہیں' اس لئے ہجرت کے بجائے وہیں مقیم رہیں اور ان کی حفاظت کریں۔

یہ سب کنفیوژن اس لئے ہوا کہ مذہب اور سیاست کو ایک کر دیا گیا اور فیصلہ سیاسی وجوہات کے بجائے مذہبی جذبات پر ہونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں موقعوں پر جن لوگوں نے ہجرت کی انہیں اس کی سزا ملی۔

مولانا آزاد اور امامت کا دعویٰ

علماء کی اکثریت اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ اگر خلافت ختم ہو گئی تو مسلمان بے سہارا رہ جائیں گے' اور ان کا مذہب کمزور ہو جائے گا۔ ان کے برعکس مولانا ابوالکلام آزاد کا نقطہ نظر مختلف تھا' ان کا کہنا تھا خلیفہ یا خلافت دونوں مسلمانوں کے ایمان اور عقیدہ سے اہم نہیں ہیں اس لئے اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ایمان کو کیسے محفوظ رکھا جائے اور مسلمان جماعت کو کیسے ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچایا جائے۔

اس مقصد کے لئے مولانا آزاد نے ایک منصوبہ پیش کیا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کا ایک امام ہونا چاہئے جو ہندوستان کے مسلمانوں کا سربراہ ہو اور دینی معاملات میں ان کی رہنمائی کرے۔ انہوں نے اپنے ایک پیروکار مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے ذمہ یہ کام لگایا کہ وہ دوسرے علماء سے اس منصوبہ کے بارے میں بات کریں۔ آزاد نے اس کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے مسلمان چونکہ بغیر کسی دینی سربراہ کے ہیں اس لئے امام انہیں اول تو متحد کرے گا' اور پھر ان کے مذہبی شعور کو بیدار رکھے گا' کیونکہ بغیر امام کے ان کا مذہب ادھورا رہے گا۔

عبدالرزاق ملیح آبادی نے امامت کے مسئلہ کو اور زیادہ وسیع کر دیا اور اس کے ہونے کی یہ دلیل دی کہ مسلمانوں کا امام نہ صرف دینی معاملات میں مددگار ہو گا بلکہ سیاسی امور میں بھی مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرے گا۔ وہ انگریزوں سے جہاد کی خاطر ہندوؤں سے معاہدہ کرے گا اور اس طرح ہندوستان کی آزادی میں نمایاں کردار ادا کر سکے گا۔

اس کے بعد سب سے اہم سوال یہ تھا کہ امام کی حیثیت' اقتدار اور طاقت تو

تسلیم' مگر یہ امام کون ہو گا؟ اس لئے ملیح آبادی نے اس کی قابلیت و صلاحیت کے بارے میں یہ شرائط رکھیں: اسے مذہبی عالم ہونا چاہیے' کردار میں پختگی ہونی چاہیے' اور منجھا ہوا سیاستدان ہونا چاہیے۔

یہ صلاحیتیں' ملیح آبادی کے خیال ہیں اور خود مولانا آزاد کے خیال میں صرف ان میں تھیں' اس لئے اس عہدے کے لئے سب سے زیادہ موزوں شخص وہی تھے۔ لہٰذا انہوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ خود امام ہونے کا اعلان کر دیں اور لوگوں سے اپنے لئے بیعت لینا شروع کر دیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب ایک مرتبہ لوگوں کی اکثریت ان کے ہاتھ پر بیعت کرے گی تو ان کے خلاف علماء میں جو مخالفت ہے وہ ختم ہو جائے گا' اور اس طرح سے وہ متحدہ طور پر امام تسلیم کر لئے جائیں گے۔

اس مقصد کے لئے مولانا آزاد نے اپنے خلفاء کو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں متعین کرنا شروع کر دیا' اور انہیں ہدایات دیں کہ وہ شہر کے لوگوں کو دعوت پر بلائیں اور پھر ان کے سامنے پورا منصوبہ رکھیں' اور امامت کے مسئلہ پر انہیں ہموار کریں۔ مولانا ملیح آبادی نے یو پی میں بطور خلیفہ کام کرنا شروع کیا اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو مولانا آزاد کی امامت پر تیار کر لیا۔

لیکن مسئلہ اس وقت بگڑنا شروع ہوا کہ جب مولانا محمود الحسن' جو دیو بند کے سربراہ تھے' مالٹا کی اسیری سے رہا ہو کر لکھنؤ آئے' اور مولانا عبدالباری فرنگی محل کے ہاں قیام کیا۔ جب مولانا ملیح آبادی نے ان دونوں علماء سے آزاد کی امامت پر گفتگو کی اور انہیں اس پر آمادہ کرنا چاہا' تو انہوں نے اس پر خاموشی اختیار کر لی۔ جب اس کی اطلاع آزاد کو دی گئی تو انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور مولانا ملیح آبادی

کو لکھا کہ وہ اپنے مشن کو جاری رکھیں' کیونکہ انہیں سندھ اور بنگال میں کامیابی ہو رہی ہے۔

لیکن پھر اچانک ۱۹۲۰ء میں آزاد نے اپنا منصوبہ ترک کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بعد میں آزاد نے اندازہ لگا لیا کہ ہندوستان کے علماء اور مسلمان سیاستدان اس بات پر راضی نہیں کہ انہیں امام تسلیم کیا جائے' اس لئے انہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ پورے منصوبہ کو ختم کر کے اپنی توجہ دوسرے معاملات کی طرف کریں اور وہاں اپنے لئے کوئی اعلیٰ مقام حاصل کریں۔

اگرچہ اس منصوبہ کو تو ختم کر دیا مگر اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ علماء کو سیاست میں لانے' اور مذہب کے ذریعہ سیاسی مسائل کو دیکھنے' جانچنے اور ان کا حل ڈھونڈنے میں آزاد بھی ذمہ دار ہیں۔ آزاد ان علماء میں پیش پیش تھے جو مذہب اور سیاست کو یکجا کر رہے تھے اور اس کا یہ نتیجہ تھا کہ اس کے بعد سے ہندوستان کے مسلمانوں نے ہر سیاسی مسئلہ کے لئے علماء سے رجوع کیا' بلکہ یہاں سے بھی بات آگے بڑھی اور اب معاشی و سماجی معاملات بھی مذہب کی روشنی میں دیکھے جانے لگے۔

اس سارے قصہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جب ایک مرتبہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کر دیا تو اس کے بعد سے سیکولر لیڈر شپ نے بھی اپنے مفادات کے لئے انہیں استعمال کیا' اور پاکستان کی تحریک میں علماء سے زیادہ مسلم لیگ کی یورپی تعلیم یافتہ لیڈر شپ نے ان مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھایا۔

سجادہ نشیں اور علماء

نو آبادیاتی دور میں سجادہ نشیں اور علماء نے اپنے سماجی مرتبہ اور مفادات کے

تحت علیحدہ علیحدہ کردار ادا کیا۔ سجادہ نشیں علماء کے مقابلہ میں سماجی طور پر زیادہ بلند

مرتبہ رکھتے تھے' اور مالی طور پر بھی ان کی حیثیت مضبوط تھی' کیونکہ ان کے آباؤ اجداد کو حکمرانوں کی جانب سے جاگیریں ملیں تھیں' اور اب ان جاگیروں کے وارث یہ تھے' اس طرح ان کی حیثیت جاگیرداروں کی بھی تھی۔ اس کے علاوہ چونکہ ان کا تعلق صوفیوں کے خاندان سے تھا' اس لئے عوام میں ان کے لئے عقیدت تھی اور ان کے مریدوں کی ایک بڑی تعداد ان پر اعتقاد رکھی تھی' اور ان کی روحانی طاقت پر یقین رکھتے ہوئے ان سے اپنے مسائل کا حل چاہتی تھی' اس طرح سے انہیں مریدوں کی جانب سے بھی نذر نیاز مل جاتی تھی جو ان کے مالی وسائل میں اضافہ کا باعث ہوتی تھی۔

چنانچہ معاشرے میں ان کی کئی حیثیتیں تھیں' یہ مزاروں اور قبروں کے رکھوالے یا متولی تھے' اور اس حیثیت میں اپنے بزرگوں کے وارث تھے' ان کی خوشنودی کی خاطر حکمران' امراء' اور عوام انہیں عقیدت کے طور پر تحفے تحائف دیا کرتے تھے' اس لئے ان کا تعلق معاشرے کے ایک ایسے طبقہ سے تھا' جو اس میں کسی تبدیلی کے خواہش مند نہیں تھے۔

کیونکہ اکثر سجادہ نشین گاؤں اور دیہاتوں میں رہتے تھے' اس لئے یہ حکومت اور عوام کے درمیان رابطہ کا کام بھی کرتے تھے' اس حیثیت میں ان کی پوزیشن اہم ہو گئی تھی' اور ہر حکومت ان کے زیر اثر علاقوں میں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ان سے تعاون کرنے پر مجبور تھی۔

جاگیردار کی حیثیت سے یہ شاعروں' ادیبوں' پہلوانوں' موسیقاروں' مذہبی اسکالرز' یا علما کی سرپرستی بھی کرتے تھے' اس لئے ان کا حلقہ اثر بڑا طاقت ور اور

مضبوط اور اسی وجہ سے کوئی حکومت ان کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کر سکتی تھی۔

برطانوی حکومت نے ان کی اہمیت کے پیش نظراس قسم کی پالیسی بنائی کہ انہیں اس میں بحیثیت تعاون کرنے والوں کے شامل کیا' انہیں علاقہ کا سربرآوردہ مانتے ہوئے خطابات اور خصوصی مراعات دے کر انہیں حکومت اور عوام کے درمیان بطور رابطہ کے استعمال کیا۔

اس حیثیت میں چونکہ سجادہ نشینوں کو حکومت کی نظروں میں عزت ملی اس لئے انہوں نے رعایا کو وفادار رہنے کی تلقین کی' اور خود بھی حکومت سے وفادار رہتے ہوئے اس کے احکامات اور ہدایات کی پیروی کی' صرف ایک دو معاملوں میں ایسا ہوا کہ کچھ خاندانوں نے حکومت کی مخالفت کرنے کی کوشش کی تو اس صورت میں حکومت نے سختی کے ساتھ انہیں کچل کر رکھ دیا' اس سے انہیں یہ بھی احساس ہو گیا کہ اگر وہ حکومت کی مخالفت کریں گے تو انہیں اپنی مراعات سے ہاتھ دھونا پڑیں گے' اور یہ ایک ایسا انتخاب تھا کہ جس کو قبول کرنے کے لئے وہ تیار نہیں تھے۔

ان کے مقابلہ میں علماء کا کردار بالکل مختلف رہا' کیونکہ ان کی حیثیت سجادہ نشینوں سے بالکل علیحدہ تھی۔ اول تو ان کے پاس کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہیں تھا' اور اپنی روزی کے لئے انہیں یا تو ملازمت کرنی پڑتی تھی یا کسی امیر کی سرپرستی کا محتاج ہونا پڑتا تھا' بحیثیت استاد یا مذہبی رسومات کی ادائیگی کرنے والے کے ان کا معاشرہ میں کوئی اعلیٰ مقام نہیں تھا۔ اس کے علاوہ یہ شہروں میں رہتے تھے' اور دیہاتوں میں ان کا اثر و رسوخ بہت کم ہوا کرتا تھا۔ اس لئے غیر مراعات یافتہ طبقہ کی حیثیت سے ان کا رویہ نو آبادیاتی حکومت کی طرف سے مخالفانہ تھا' اور اس کی مختلف وجوہات تھیں: نئی حکومت میں انہیں وہ عہدے اور سہولتیں نہیں ملیں جو سابقہ

حکومتوں میں تھیں۔ وقف کے ادارے کے خاتمہ کے بعد ان کی آمدنی کا ایک بڑا

ذریعہ ختم ہو گیا اور جب حکومت نے اپنے اسکول کھولنا شروع کئے تو مدرسوں کی حیثیت کم ہو گئی کیونکہ طلباء کی اکثریت حکومت کے اسکولوں میں پڑھنا پسند کرتی تھی' کیونکہ اس تعلیم کے بعد ان کے ملازمت کے مواقع زیادہ تھے۔

حکومت نے بھی سجادہ نشینوں کی طرح علماء کی زیادہ سرپرستی نہیں کی' کیونکہ وہ ان کے مفادات میں زیادہ استعمال نہیں ہو سکتے تھے' اس لئے علماء حکومت کے ڈھانچہ میں شامل نہیں ہو سکے اور اس سے محروم رہے۔ یہ ضرور ہوا کہ جب بھی حکومت کو فتووں کی ضرورت پڑی' تو اس نے انفرادی طور پر علماء سے اپنی مرضی کے فتوے حاصل کر لئے۔

حکومت کی سرپرستی سے محرومی کے نتیجہ میں علماء نے مذہبی و سیاسی تنظیموں کو بنانے اور چلانے میں بھرپور حصہ لیا اور اس طرح معاشرہ میں ان کے بارے میں جو تاثر ابھرا وہ یہ کہ یہ نو آبادیاتی نظام کے خلاف تھے' اور انہوں نے آزادی کی جنگ میں حصہ لیا۔

علماء پاکستان کے بعد

علماء اور اسلام کی ترقی کا عمل

پاکستان کی تحریک میں ممتاز اور بڑی مذہبی جماعتیں جن میں جمعیت علماء ہند' جماعت اسلامی' اور مجلس احرار شامل ہیں' پاکستان کے نظریہ کی مخالف تھیں' لیکن مسلم لیگ نے ان مذہبی جماعتوں کی مخالفت کے باوجود ان مذہبی جذبات کو اپنے مقاصد کے لئے پوری طرح سے استعمال کیا کہ جو خلافت کی تحریک کے زمانہ میں مسلمانوں میں پیدا کر دیئے گئے' تھے لیکن مسلم لیگ کو بہرحال اس بات کا احساس تھا کہ اس کے راہنما روایتی مذہبی راہنما نہیں ہیں' اس لئے انہیں اپنے مفادات کے حصول کے لئے علماء کی حمایت انتہائی ضروری ہے تا کہ ان کے سیاسی فیصلوں کی مذہبی توثیق ہو سکے۔

جب مولانا شبیر احمد عثمانی نے مسلم لیگ کی حمایت کی تو ۱۹۴۵ء علماء کی ایک علیحدہ جماعت 'جمیعت علماء اسلام' کے نام سے تشکیل دی گئی۔ اگرچہ اس میں مشہور علماء

شامل نہیں تھے' مگر اس کمی کے باوجود اس نے مسلم لیگ کے سیاسی مقصد کو پورا کیا۔

۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ نے مشائخ کی ایک کمیٹی کو قائم کیا' اس کے بارے میں سلیم۔ ایم۔ قریشی نے اپنے مقالہ "پاکستان میں مذہب و سیاست" میں لکھا ہے کہ "نواب ممدوٹ" سر فیروز خاں نون' اور سردار شوکت حیات جیسے لوگ بھی کہ جو کسی طور سے مذہبی نہیں تھے۔ انہیں مذہبی خطابات دیئے گئے جیسے ممدوٹ شریف' دربار سرگودھا شریف وغیرہ' تاکہ عام مسلمانوں کو یہ تاثر دیا جائے کہ ان کے حامیوں میں بڑے بڑے مشائخ بھی ہیں

اس طرح مسلم لیگ نے پاکستان بننے کے دوران علماء مشائخ' اور مذہبی جذبات کو کامیابی سے استعمال کیا' لیکن جب ملک تقسیم ہو گیا' اور پاکستان بن گیا تو اس کے بعد اب علماء کی باری تھی کہ وہ حکومت پر دباؤ ڈالیں کہ ملک میں شریعت کا نفاذ کیا جائے تاکہ وہ ایک اسلامی مملکت بن سکے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے پاکستان کے قیام کے فوراً بعد یہ مطالبہ کیا کہ حکومت کے کلیدی اور اعلیٰ عہدے صرف مسلمانوں کو دیئے جائیں' اور وہ لوگ بھی کہ جو محض برائے نام مسلمان ہیں انہیں یہ ذمہ داری نہیں سونپی جائے' لہٰذا غیر مسلموں کو تو حکومتی عہدوں پر تقرر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے مسلم لیگ پر سخت تنقید کی اور اس پر الزام لگایا کہ اس نے پاکستان بننے کے بعد' علماء کو ایک طرف کر دیا' اور اس کے بعد سے ان کی ہدایات و مشوروں پر عمل نہیں کیا گیا۔ انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ علماء کی ایک کمیٹی بنائی جائے' تاکہ یہ کمیٹی دستور بنانے کے عمل میں شریک ہو۔ چنانچہ علماء کی اس کمیٹی نے ۱۹۴۹ء میں قرارداد مقاصد کے نام سے ایک دستاویز تشکیل دی جس میں اعلان کیا گیا ہے کہ "پوری کائنات پر خدا کی حکمرانی ہے اور ریاست اپنی حاکیت اور ہدایات کے

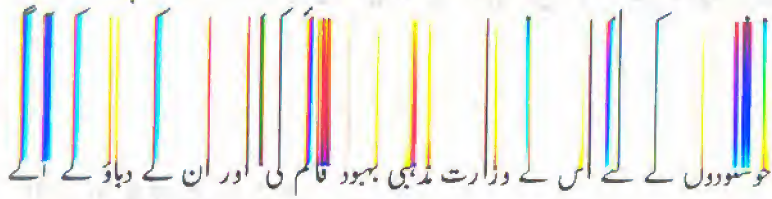
لئے عوام کے منتخب نمائندوں کی محتاج ہو گی۔ اس طرح عوام کے نمائندوں سے اقتدار اعلیٰ کا حق چھین لیا گیا"۔

کمیٹی نے صدارتی نظام حکومت کی سفارش کی اور صدر کے عہدے لئے' یہ لازمی قرار دیا کہ وہ مرد ہو اور مسلمان ہو' عورتوں کو صدر بننے کے حق سے محروم کر دیا گیا بلکہ ان پر یہ بھی پابندی لگا دی کہ وہ مجلس قانون ساز کے لئے انتخاب میں بھی حصہ نہیں لے سکتی ہیں' اور اگر کوئی حصہ لے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی عمر ۵۰ سال کی ہو' اور با پردہ خاتون ہو

اس طرح علماء نے دستور بنانے میں جو حصہ لیا' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۵۷ء ' ۱۹۶۲ء' اور ۱۹۷۳ء کے دستوروں میں جو دفعات رکھی گئیں ان میں خصوصیت سے تین دفعات خاص طور سے قابل ذکر ہیں کہ پاکستان کا نام اسلامی ریپبلک آف پاکستان ہو گا۔ (جب ایوب خان نے اس کو اپنے بنائے ہوئے دستور سے حذف کر دیا تو اس پر سخت احتجاج ہوا' اور اسے یہ دفعہ دستور میں رکھنا پڑی')۔ ملک کا سربراہ مسلمان ہو گا اور قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔

ایوب خان نے اس بات کی ضرور کوشش کی کہ معاشرہ میں سیکولر قوانین کو نافذ کیا جائے جن میں عائلی قوانین بھی شامل تھے' جو ۱۹۶۱ء میں پاس ہوئے اور علماء کی مخالفت کے باوجود انہیں برقرار رکھا گیا مگر علماء نے اور دوسری چیزوں میں اپنی اتھارٹی کو قائم کیا۔ جس میں خاص طور سے رویت ہلال کمیٹی تھی کہ جو عید کے چاند کے بارے میں فیصلہ کرتی تھی' اس کے علاوہ انہوں نے ایوب کے زمانہ میں پروفیسر فضل الرحمان کے خلاف مہم چلا کر انہیں سرکاری عہدے سے برطرف کرایا اور اس طرح آہستہ آہستہ انہوں نے اپنے اثر و طاقت کو معاشرہ میں محسوس کرایا۔

بھٹو نے اپنے دور حکومت میں ان علماء کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا اور ان کی



خوشنودی کے لئے اس نے وزارت مذہبی بہبود قائم کی اور ان کے دباؤ کے آگے اس نے گھٹنے ٹیک دیئے' لیکن علماء کا عروج ضیاء الحق کے زمانہ میں ہوا۔

پاکستان کی مختصر تاریخ میں ہم علماء کا آہستہ آہستہ طاقت ور ہونا دیکھتے ہیں' اس کی ابتداء اس طرح سے ہوئی کہ سیکولر لیڈر شپ نے انہیں خوش کرنے کے لئے ان کے تھوڑے بہت مطالبے مان لئے تاکہ ان کی حمایت کو حاصل کیا جائے' لیکن ان کی یہی کمزور' علماء کے آگے بڑھنے میں معاون ثابت ہوئی' اور اس کے نتیجہ میں جمہوری اور سیکولر ادارے برابر کمزور ہوتے چلے گئے' اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ تمام سیاسی پارٹیاں خود کو مذہبی ثابت کرنے کے لئے علماء کے ہاتھوں کھلونا بن گئیں' اور اب تمام سیاسی' و معاشی اور سماجی معاملات کو مذہب کے ذریعہ سمجھا جانے لگا ہے' اور ہر ایک جماعت خود کو زیادہ مذہبی بنانے کے لئے علماء کے مشوروں پر عمل کر رہی ہے۔

اس صورت حال کا علماء نے خوب فائدہ اٹھایا اور اپنی طاقت کو محسوس کرتے ہوئے اب انہوں نے خود اپنی سیاسی جماعتیں بنا لیں ہیں' تاکہ سیاسی لیڈروں کے محتاج نہیں رہیں اور خود اپنی جماعتوں کے ذریعہ حکومت میں شامل ہوں۔

اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاست کے بارے میں علماء کے نظریات و افکار کا مطالعہ کیا جائے' اور دیکھا جائے کہ وہ کس قسم کی ریاست کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں' اور مختلف سیاسی امور پر ان کی کیا رائے ہے؟

اسلامی ریاست کا تصور

مثلاً پاکستان کے قیام کے فوراً بعد سیکولر لیڈر شپ اور علماء کے درمیان اس

بات پر کش مکش ہوئی کہ پاکستان کو کس قسم کی ریاست بنایا جائے' کیا یہ ملک ایک سیکولر' جمہوری ہو کہ جس میں ہر عقیدے و مذہب کے لوگوں کو برابر کے حقوق ملیں اور ان کے ساتھ کسی قسم کا امتیازی سلوک نہ ہو' اور یا اسے ایک اسلامی ریاست بنایا جائے کہ جس میں صرف مسلمانوں کو تمام حقوق ہوں' اور غیر مسلموں کو ثانوی شہری کا درجہ دیا جائے' اگرچہ قائداعظم نے بار بار مختلف اعلانات' بیانات' اور انٹرویوز میں اس بات کو صاف طور سے کہا تھا کہ پاکستان ایک سیکولر ملک ہو گا کہ جس میں ہر شہری کے برابر کے حقوق ہوں گے اور اس بات کو انہوں نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء میں قانون ساز اسمبلی میں کہا تھا۔

مگر علماء نے اس قسم کی ریاست کی ابتداء ہی سے سخت مخالفت کی اور اس بات کی جدوجہد کی کہ نئی ریاست کو اسلامی اور مذہبی بنایا جائے' کیونکہ پاکستان بنانے کے عمل میں مسلمانوں سے یہی وعدہ کیا گیا تھا' اور مسلمانوں سے اس ریاست کی تشکیل کے لئے قربانیاں دی تھیں' جسٹس منیر نے جو کمیشن قادیانی فسادات کے بعد بنایا تھا' اور اس کے بعد اپنی جو رپورٹ تیار کی تھی اس میں انہوں نے ان مسائل کو علماء سے انٹرویو کے بعد دیا ہے' مثلاً مولانا امین احسن اصلاحی نے کہا کہ' قائداعظم کا ماڈرن ریاست کا تصور اس وقت متروک ہو گیا کہ جب علماء کی کمیٹی نے قرارداد مقاصد کا مسودہ تیار کر لیا' لہٰذا اب اس کے بعد سے ریاست کو اسلامی نظریات پر تشکیل ہونا چاہیے۔

لیکن پھر جب یہ سوال آیا کہ ایک اسلامی ریاست کو کن اصولوں پر بنانا چاہیے' اور اس کی کون سی شکل ہونی چاہیے؟ تو اس کے نتیجہ میں مختلف علماء کی رائے میں اختلاف تھا' اور صرف اختلاف ہی نہیں بلکہ بعض اوقات بالکل متضاد رویہ اختیار کیا

گیا' مثلاً جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ مسلم دور حکومت میں' وہ کون سا زمانہ تھا کہ

جسے اسلامی کہا جائے؟ اور اسلامی معیار کے مطابق اسے آئیڈل قرار دیا جائے تو اس میں علماء نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا۔ ان میں کچھ نے رسول اللہ کے عہد کو مثالی قرار دیا۔ کچھ نے اس میں وسعت دے کر خلفاء راشدین کے عہد کو بھی شامل کر لیا' کچھ نے اس میں عمر بن العزیز کے دور حکومت کو بھی مثالی قرار دیا' کچھ نے صلاح الدین ایوبی' محمود غزنوی' محمد تغلق' اور اورنگ زیب کو مثالی حکمراں کے طور پر پیش کیا۔

ان تمام علماء کے بیانات کے بعد جسٹس منیر نے جو خلاصہ تیار کیا اس کے مطابق ایک اسلامی ریاست میں جو خصوصیات ہونی چاہئیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ وہ تمام قوانین جو قرآن اور حدیث میں موجود ہیں انھیں دستور کا ایک حصہ بنا لینا چاہیے۔

۲۔ ہر وہ دفعہ کہ جو قرآن و حدیث کے خلاف ہے اسے دستور سے ختم کر دیا جائے۔

۳۔ بین الاقوامی قانون یا معاہدوں کی کوئی بھی دفع کہ جو قرآن و حدیث کے خلاف ہو گی' اس کی پابندی کرنا پاکستان کے لئے ضروری نہیں ہو گا۔

اس ماڈل کو ذہن میں رکھتے ہوئے جسٹس منیر نے جو ریمارکس دیئے ہیں وہ یہ کہ اگر دستور سے عوام کی حاکیت کو خارج کر دیا جائے' تو پھر اس صورت میں اس ملک کو جمہوری کہنا سراسر مذاق ہو گا۔ کیونکہ اگر قانون بنانے کے عمل سے عوام اور ان کے نمائندوں کو نکال دیا جائے' اور یہ حق صرف علماء اور فقہاء کو دے دیا جائے' تو یہ جمہوری عمل کے خلاف قدم ہو گا' اور یہ عمل معاشرہ کو جمہوری نہیں بنائے گا بلکہ

علماء کی حاکمیت کو قائم کر دے گا۔

علماء نے اسلامی ریاست کو جمہوری شکل دینے کے لئے اس بات کی کوشش کی کہ جدید اصطلاحات کا استعمال کیا جائے' مثلاً پارلیمینٹ یا اسمبلی کو شوریٰ کہا گیا' امیر آج کل کا صدر بن گیا' ارباب حل و عقد' مشیر ہو گئے' اور اجماع کو عوامی رائے کا نام دے دیا گیا یہ سب اس لئے کیا گیا تاکہ یہ ثابت کیا جائے کہ ان کی نظروں میں جو اسلامی ریاست کا خاکہ ہے' اس کا جدید سیاسی روایات سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔

مذہبی اقلیتیں

آج کل کی جدید قومی ریاست میں ایک قوم کی تشکیل زبان' تاریخ' اور جغرافیائی حدود میں رہنے پر ہوتی ہے' اور اس میں ہر شہری کو برابر کے حقوق ملتے ہیں' اور یہ اس کا حق ہوتا ہے کہ وہ ریاست اور معاشرہ کے امور میں مکمل طور پر حصہ لے۔ اس کے ساتھ مذہب کی بنیاد پر کوئی تعصب نہیں برتا جاتا۔ اس چیز کو ذہن میں رکھتے ہوئے جسٹس منیر نے علماء سے اس سوال کو پوچھا کہ وہ اسلامی ریاست میں مذہبی اقلیتوں کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ اور ان کا سیاسی و سماجی طور پر معاشرہ میں کیا مقام ہو گا؟

علماء کی اکثریت اس پر متفق تھی کہ غیر مسلموں کے ساتھ بطور ذمی سلوک کیا جائے گا' انہیں پاکستان کے شہری کی حیثیت سے مکمل اختیارات نہیں ہوں گے' اور نہ ہی انہیں اہم اور کلیدی عہدوں پر فائز کیا جائے گا۔

ایک عالم مولانا ابو لحسنات نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ:

''ان کی پوزیشن ذمیوں کی ہو گی' ملک کے قانون بنانے میں ان کی رائے کو قطعی

دخل نہیں ہو گا' نہ انہیں قانون کے نفاذ کا حق ہو گا' اور نہ ہی اہم عہدوں پر ان کا تقرر ہو گا"۔ جب مولانا حامد بدایونی سے قائداعظم کی اس تقریر کے بارے میں سوال کیا گیا کہ جس میں انہوں نے ہندوؤں' عیسائیوں' اور مسلمانوں کو پاکستان کا شہری قرار دیا تھا تو انہوں نے کہا کہ : "وہ اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ تمام مذہبی جماعتیں چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم' انہیں ان کی آبادی کے تناسب سے' انتظامیہ اور ریاست کے امور میں حصہ دیا جائے لیکن غیر مسلموں کو فوج اور عدلیہ میں نہ لیا جائے' نہ ان کا تقرر بطور وزیر کے ہو' اور نہ ہی ایسے عہدوں پر کہ جن میں ریاست کی اہم ذمہ داریاں ہوتی ہیں"۔

مولانا بدایونی کی دلیل کے مطابق پاکستان میں غیر مسلم رہنے والے اس لئے ذمی نہیں ہیں کہ یہ ملک فتح کے بعد حاصل نہیں کیا گیا ہے' اور نہ ہی یہ معاہدے والے ہیں کیونکہ ان کے ساتھ کسی قسم کا معاہدہ بھی نہیں کیا گیا ہے' لہٰذا یہ اسلامی ریاست کے شہری نہیں ہو سکتے۔

اس کے بعد دوسرا سوال یہ تھا کہ اگر ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلم اس کے شہری نہیں ہو سکتے تو ان مسلمان اقلیتوں کے بارے میں کیا رائے ہے کہ جو غیر مسلمان ملک میں ہیں؟ اس سوال کے جواب میں مولانا عطاء اللہ بخاری نے کہا کہ یہ ناممکن ہے کہ ایک مسلمان غیر مسلمان ملک کا وفادار شہری ہو سکے۔ جب اس پر یہ سوال پوچھا گیا کہ کیا ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یہ فرض ہے کہ وہ اپنی ریاست کے وفادار رہیں؟ تو مولانا نے کہا "ہرگز نہیں"۔

اس سوال پر کہ کیا آپ ہندوؤں کو یہ اجازت دیں گے کہ وہ اپنا دستور اپنے مذہب کے اصولوں پر بنائیں' تو مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے کہا کہ "یقیناً' اور مجھے اس

بات پر قطعی اعتراض نہیں ہو گا کہ اگر منو کے شاستروں کے مطابق ان کی حکومت میں مسلمانوں کو شودر اور ملیچھ کے طور پر رکھا جائے' اور انہیں حکومت کا حصہ دار بننے سے روکا جائے' اور بطور شہری انہیں کوئی حقوق نہیں دیئے جائیں۔"

منیر کمیشن نے اس کے بعد ایک سوال اور پوچھا کہ "ہندوستان کے مسلمانوں پر ہندوستان و پاکستان کے درمیان جنگ کی صورت میں کیا فرض عائد ہوتا ہے؟" اس کا جواب دیتے ہوئے مولانا عبدالحسنات نے کہا کہ "ان کا فرض ہے کہ وہ ہمارا ساتھ دیں اور ہندوستان کے خلاف لڑیں"۔ مولانا مودودی نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا کہ ان کا جو فرض ہے وہ ظاہر ہے کہ وہ نہ تو پاکستان کے خلاف لڑیں' نہ کوئی ایسا کام کریں کہ جس سے پاکستان کے تحفظ کو نقصان پہنچتا ہو۔

اگر علماء کی مذہبی اقلیتوں کے بارے میں اس پالیسی پر عمل کیا جائے تو اس صورت میں نہ غیر مسلموں کو پاکستان میں کوئی حقوق ملیں گے' اور نہ ہی مسلمانوں کو غیر مسلم ریاستوں میں' اور دونوں صورتوں میں اقلیتوں کا مذہبی بنیادوں پر استحصال ہو گا' اور انہیں بطور غدار اور غیر وفادار شہری کے سمجھا جائے گا۔ اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ علماء اور ہندو فرقہ پرست جماعتوں کی رائے اس بارے میں ایک ہی ہے۔ دونوں انسانی مسائل سے علیحدہ ہٹ کر صرف مذہبی بنیادوں پر اس مسئلہ کو جانچتے اور پرکھتے ہیں۔

پاکستان میں اس پالیسی پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اپنی مذہبی اقلیتوں کو قوم کی تشکیل سے علیحدہ کر دیا' اور ان کی صلاحیتوں سے معاشرہ نے فائدہ نہیں اٹھایا' شہری حقوق سے محروم ہونے کی وجہ سے ان میں جو احساس محرومی پیدا ہوا' اس نے انہیں اور زیادہ پس ماندہ بنا دیا۔ ہمارے علماء موجودہ مذہبی اقلیتوں کی تعداد

سے مطمئن نہیں تھے اس لئے انہوں نے اور اقلیتوں کو پیدا کرنا شروع کیا' اس کی

ابتداء جب ہوئی جب احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے کر انہیں اقلیت بنا دیا' اس کے بعد ذکریوں کا نمبر ہے' جنہیں غیر مسلم قرار دینے پر زور دیا جا رہا ہے' اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ہمارے ہاں خاصی تعداد غیر مسلم اقلیتوں کی ہو جائے گی۔

علماء اور معاشرہ

اس باب میں ان طریقوں اور عوامل پر روشنی ڈالی جائے گی کہ جن کے ذریعہ علماء معاشرہ میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھاتے ہیں' یہاں ان اداروں کے بارے میں تذکرہ کیا جائے گا کہ جو معاشرہ میں علماء کی حاکیت کو مضبوط اور مستحکم کرتے ہیں' ان میں سے مدرسہ پر ہم پچھلے صفحات میں ذکر کر آئے ہیں کہ کس طرح ان مدارس نے علماء کو معاشرہ میں ایک خاص مقام دیا اور ایک وقت تک یہ مدارس انتظامیہ کے لئے مذہبی عہدے داروں کی تربیت کرتے رہے' مگر جب مسلمان حکمرانوں کا دور ختم ہوا اور انگریز برسر اقتدار آئے تو ان مدارس کی سیاسی حیثیت ختم ہو گئی' اور اب سرکاری تنخواہ دار ملازمین کے بجائے علماء کا گزر عوام کے چندوں پر ہونے لگا' جس سے کہ ان کا سماجی مرتبہ بری طرح سے متاثر ہوا لیکن معاشرہ میں کچھ مذہبی رسومات اور مذہبی ادارے ایسے ہیں کہ جو اب تک اس کی سماجی اور مذہبی ضروریات کو پورا کرتے ہیں' اور انہیں کے سہارے علماء کا وجود بھی قائم ہے۔



علماء اور مسجد

مسلمان دور حکومت میں حکمرانوں اور امراء کا یہ دستور تھا کہ وہ فتح کی خوشی میں یا نیکی و تقویٰ کے اظہار کے طور پر مساجد کی تعمیر کراتے تھے' اور ان کے اخراجات کے لئے اس سے منسلک وقف کی جاگیر یا جائداد ہوا کرتی تھی جس سے کہ امام' خطیب' اور موذن کو تنخواہیں ملا کرتی تھیں۔ ابتدا میں ریاست مساجد کے ملازمین کا تقرر کرتی تھی اور ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھتی تھی' اس لئے مساجد کا عملہ حکومت کی ہدایات پر عمل کرتا تھا اور لوگوں کو حکومت کا وفادار رہنے کی تلقین کرتا تھا۔

لیکن جب انگریزی اقتدار قائم ہوا تو صورت حال بالکل بدل گئی' اس دوران میں کئی مذہبی جماعتیں پیدا ہوئیں جن کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں مذہبی شناخت کو قائم رکھا جائے' اور اپنے عقائد و نظریات کے تحت زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی جماعت میں شامل کیا جائے۔ ان کی سرگرمیوں کے مراکز مدرسہ اور مسجد تھے' اس لئے ان جماعتوں کی کوشش تھی کہ اپنے پیروکاروں کی تعداد بڑھانے کی خاطر زیادہ سے زیادہ مساجد پر قبضہ کیا جائے' مساجد کی تعداد پر قبضہ یا ان پر اپنے اثر و رسوخ قائم کرنے سے ان مذہبی جماعتوں کی طاقت بڑھ جاتی تھی۔ اس لئے جب پہلے سے بنی ہوئی مساجد پر کسی نہ کسی مذہبی جماعت کا قبضہ ہوگیا تو پھر ہر ایک جماعت نے جگہ جگہ نئی مساجد کی تعمیر شروع کر دی۔ اس مرتبہ نئی تعمیر شدہ مساجد کی خاص بات یہ تھی کہ یہ عوام کے چندے سے بن رہی تھیں اور اس طرح مذہبی جماعتوں اور ان کے عقائد کی تبلیغ و تشہیر میں وہ بھی برابر کا حصہ لے رہے تھے۔

مساجد کی تعمیر میں چندے کا یہ استعمال کئی لحاظ سے قابل ذکر ہے' لیکن یہ سلسلہ

جس کی ابتداء نو آبادیاتی دور سے ہوئی تھی' اب تک قائم ہے اور اس طرح تعمیر مسجد کے لئے چندہ ایک مستقل ادارہ کی شکل اختیار کر چکا ہے' کیونکہ یہ چندہ مسجد کے ملازمین اور اس کے متولین کے لئے ذریعہ آمدنی ہے' اس لئے مسجد کی تعمیر جب ایک مرتبہ شروع ہوتی ہے تو پھر یہ ختم نہیں ہوتی ہے' اس میں مسلسل تبدیلی کی جاتی رہی ہے' اس کی زیب و آرائش کے لئے قیمتی ٹائلز استعمال کئے جاتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض مساجد تو ضرورت سے زیادہ آرائش کا شکار ہو جاتی ہیں' اس کے پس منظر میں جو مقصد ہوتا ہے وہ یہ کہ چندہ کا استعمال جائز قرار دیا جائے اور تعمیر کے کام کو جاری رکھ کر چندہ وصول کیا جاتا رہے۔

اس سے پہلے جو مسجدیں بنائی جاتی تھیں ان کے اخراجات کے لئے وقف کی جائداد ہوتی تھی' یا حکومت کی جانب سے اس کے اخراجات ادا کئے جاتے تھے' مگر اب یہ صورت حال نہیں ہے اس لئے نئی مسجدوں کے اخراجات کے لئے اور مستقل آمدنی کے ذرائع کے لئے اب ان کے اردگرد دکانیں تعمیر کر دی جاتی ہیں جو کہ مسجد کے اخراجات کو پورا کرتی ہیں' اس طرح سے مسجد کے امام' خطیب' اور موذن کے لئے مسجد نہ صرف مالی ذرائع آمدنی پوری کرتی ہے بلکہ ان کے مذہبی مرتبہ کو قائم رکھتی ہے۔

انگریزوں کے زمانہ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ جن میں ایک فرقہ کے لوگوں نے کسی مسجد پر زبردستی قبضہ کر لیا اور پھر وہاں دوسرے فرقہ کے لوگوں کو عبادت کرنے سے روک دیا۔ خصوصیت سے اس قسم کے جھگڑے اہل حدیث اور دوسرے فرقوں کے درمیان بہت ہوئے جن میں کہ اہل حدیث کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ دوسری مساجد میں جا کر اپنے طریقہ سے نماز پڑھیں' چونکہ وہ آمین کو زور سے

ادا کرتے تھے اس لئے دوسرے فرقہ والے ان کے اس طریقہ عبادت کو پسند نہیں

کرتے تھے۔ اس لئے ایسا اکثر ہوا کہ ان کے جانے کے بعد مسجد کو دھو کر پاک و صاف کیا جاتا تھا' ورنہ دوسری صورت میں انہیں زبردستی مسجد سے باہر کر دیا جاتا تھا' اور نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

بی۔ ڈی۔ مٹکاف نے اپنی کتاب "دور برطانیہ میں اسلامی احیاء" میں اس قسم کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ مثلاً محمد سعد اللہ اور اس کے ساتھی کہ جو اہل حدیث تھے انہیں مئو کی ایک مسجد میں نماز نہیں پڑھنے دی گئی' اور انہوں نے آخرکار قریبی جنگل میں جا کر نماز پڑھی' اور بعد میں انہوں نے علیحدہ سے اپنی مسجد تعمیر کی' چونکہ اہل حدیث کے ساتھ یہ تعصبانہ برتاؤ ہوتا تھا' اس لئے انہوں نے اس کے خلاف برطانوی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ انہیں عام مسجدوں میں نماز پڑھنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ ۱۸۸۹ء میں اس مقدمہ کا فیصلہ لکھتے ہوئے جسٹس محمود' جو کہ سرسید کے لڑکے تھے۔ لکھا کہ :

ایک مسجد پر قبضہ کرنے یا اس پر صرف اپنا اثر رکھنے کا حق کسی بھی مسلمان فرقہ یا مسلک کا حق نہیں ہے۔ وہابی یا محمدی چونکہ مسلمان ہیں اس لئے یہ ان کا حق ہے کہ وہ کسی بھی مسجد میں نماز ادا کریں۔ لیکن اگر کوئی محمدی یا وہابی نماز کی ادائیگی سے کسی دوسرے فرقہ کے جذبات کو مجروح کرتا ہے یا ان کی عبادت میں خلل اندازی کرتا ہے تو یہ قدم قابل تعریف نہیں۔

اس کے علاوہ مٹکاف نے اور بہت سے ایسے واقعات لکھے ہیں کہ جن میں اہل حدیث ' برطانوی حکومت اور دوسرے فرقے ملوث تھے۔ مثلاً ۱۸۹۲ء میں میرٹھ میں مذہبی فسادات کو روکنے کی غرض سے مجسٹریٹ نے شہری مساجد کو تقسیم کر دیا تھا' اس

تقسیم کے نتیجہ میں ۵ مساجد اہل حدیث کو دی گئی جبکہ باقی مساجد حنفی مسلک سے تعلق رکھنے والوں کو۔

مساجد کی یہ جنگ نو آبادیاتی دور سے لے کر اب تک جاری ہے۔ اب ہر فرقہ اور مذہبی جماعت نے ہر محلّہ میں اپنی علیحدہ سے مسجد قائم کر رکھی ہے اور ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ اس پر ان کا قبضہ باقی رہے۔ جب کہ دوسرے فرقوں کی جانب سے یہ کوشش جاری رہتی ہے کہ ایک دوسرے کی مسجد پر کیسے قبضہ کیا جائے۔ اس ڈر اور خوف کی وجہ سے ہر فرقہ والا اپنی جگہ ہوشیار رہتا ہے اور کسی دوسرے فرقہ والوں کو اپنی مسجد میں قدم نہیں رکھنے دیتا۔ اور اب ہو یہ رہا ہے کہ جیسے جیسے نئی مذہبی جماعتیں بن رہی ہیں اور نئے فرقہ پیدا ہو رہے ہیں' اس طرح سے مسجدوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے اور اس لئے اب ہر محلّہ میں ۴ یا ۵ مسجدیں بالکل قریب قریب ہوتی ہیں' کہ جن کے میناروں پر طاقت ور لاؤڈ اسپیکرز نصب ہوتے ہیں' ہر مسجد میں موذن' امام سے لے کر ایک مدرسہ بھی ہوتا ہے۔ معاشی طور پر مسجد اپنے اخراجات پورے کرنے کے قابل ہوتی ہے کیونکہ یہ آمدنی دوکانوں سے آتی ہے اور مزید چندہ کے ذریعہ اس آمدنی کو بڑھایا جاتا ہے۔

اسلامی دور کے ابتدائی زمانہ میں مسجد سیاسی و سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی' لیکن فرقہ وارانہ تعصبات اور نفرتوں کی وجہ سے مسجد کا درجہ اب وہ نہیں رہا' بلکہ اس کے برعکس اب مساجد میں مذہبی جذبات کو ابھارا جاتا ہے اور دوسرے فرقوں کے خلاف نفرت کو پیدا کیا جاتا ہے۔

موجودہ دور میں مسجد کی اس اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے آمرانہ حکومتوں اور جمہوری راہنماؤں نے بھی مسجد کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔



ہے اور اب یہاں پر امام و موذن اور خطیب کا تقرر بھی حکومت کی جانب سے ہوتا ہے' حکومت کے تنخواہ دار ہونے کی حیثیت سے مسجد کے یہ امام و خطیب اب ہر حکومت کو چاہے وہ فوجی ہو' آمرانہ ہو' یا جمہوری اس کی حمایت کرتے ہیں اور اسے عین اسلامی قرار دیتے ہیں۔ حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ہی ان کی وفاداریاں بھی بدل جاتی ہیں اور یہ نئی حکومت کے اسلامی ہونے کی دلیل تلاش کرنے لگتے ہیں

علماء اور مناظرہ

ہندوستان میں برطانوی حکومت سے پہلے عوام کے سامنے مناظرے کا کوئی دستور نہیں تھا' علماء اور ہندو پنڈت مسجدوں اور مندروں میں مذہبی موضوعات پر تقریریں یا بحث و مباحثہ کر لیتے تھے۔ اکبر کے دور میں ضرور علماء اور عیسائی مشنریوں کے درمیان مناظرے ہوئے مگر یہ بھی دربار تک محدود ہوا کرے تھے۔ اکثر اس بات کی کوشش ہوتی تھی کہ دوسرے کے مذہب کو نہ تو برا کہا جائے اور نہ ان کی مذہبی رسومات پر حملہ کیا جائے۔ اس طرح دونوں مذاہب کے مذہبی راہنماؤں کے درمیان ایک قسم کا خاموش سمجھوتہ تھا وہ کسی کے مذہبی عقیدوں کو جھوٹا ثابت کرنے کی فکر میں نہیں رہتے تھے اور اس طرح انہوں نے آپس میں پرامن طریقہ سے رہنا سیکھ لیا تھا۔

مذہبی رواداری اور امن پسندی کا اس وقت خاتمہ ہونا شروع ہوا جب عیسائی مشنری تبلیغ کی غرض سے ہندوستان آنا شروع ہوئے' مشنریوں کی جماعتیں جدید تعلیم و تربیت' تنظیمی ڈھانچہ' ڈسپلن' حکومت و عہدے داروں کی سرپرستی کہ وجہ سے زیادہ فعال اور موثر تھیں۔ انہوں نے اسلام اور ہندوستان کے مذاہب کا مطالعہ اس مقصد

کے تحت کیا تھا کہ ان کی خامیوں کو اجاگر کیا جائے اور ان پر حملہ کر کے انہیں شکست دی جائے۔ انہوں نے چھاپہ خانہ کی ایجاد سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور بڑی تعداد میں اپنے مذہبی عقیدوں پر کتابیں اور پمفلٹس لکھے اور ان کو آزادانہ طریقے سے لوگوں میں تقسیم کیا۔ انہوں نے تبلیغ کے لئے بھی نئے نئے طریقوں کو اختیار کیا کہ جس سے ہندوستان کے لوگ اب تک واقف نہیں تھے۔ مثلاً وہ بازاروں' تہواروں' تقریبات کے موقعوں پر لوگوں کو اکٹھا کر لیتے تھے' اور ان کے درمیان کھڑے ہو کر اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرنا شروع کر دیتے تھے ۳۰ر مارچ ۱۹۸۹ء میں لاہور ٹریبون نے لکھا کہ :

"آج یہاں پر گلیوں میں تبلیغ کرنے کا بڑا فیشن ہو گیا ہے' تمام انارکلی میں ہندو' مسلمان' عیسائی' آریہ' اور برہمو مبلغ بڑے خلوص اور جذبہ کے ساتھ مجمع میں گھر ہوئے غور سے سننے والوں کے درمیان اپنے عقائد کی خوبیاں بیان کرتے نظر آتے ہیں۔

مناظروں کا جب سلسلہ شروع ہوا تو اس کی وجہ سے علماء بھی بڑے سرگرم ہو گئے کیونکہ ان کے مذہب پر جو حملے ہو رہے تھے اگر ان کا جواب نہیں دیا جاتا' اور اپنے عقائد کی سچائی کو بیان نہیں کیا جاتا تو اس صورت میں عام مسلمانوں کے گمراہ ہونے کا خطرہ تھا۔ اس لئے انہوں نے نہ صرف ان سوالوں کا جواب ڈھونڈا کہ جو اسلام کے بارے میں کئے جا رہے تھے' بلکہ عیسائیت اور ہندو مذاہب کو اس نظر سے پڑھا کہ ان میں کیا کیا کمزوریاں ہیں اور ان پر کس طرح سے حملہ کیا جائے۔

لیکن یہ مناظرہ صرف اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان ہی نہیں تھا بلکہ یہ مسلمانوں کے مذہبی فرقوں کے درمیان بھی ہونے لگا کہ جس میں ہر فرقہ اور مسلک

کے علماء اپنے عقائد کو دوسروں پر ترجیح دیتے تھے۔

مناظرہ کرنے کا جب فیصلہ ہوجاتا تھا تو اس کا طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ مخالف جماعتیں مناظرے سے پہلے شراط طے کیا کرتی تھیں' مثلاً یہ کہ مباحثہ کتنے دن جاری رہے گا' ۵ دن یا ۱۵ دن' اور جو مباحثہ میں ہار جائے گا اسے اپنا مذہب چھوڑ کر مخالف کے عقائد کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ لیکن مناظر کے آخر میں ہمیشہ سے یہ مسئلہ ہوتا تھا کہ کوئی بھی اپنی شکست تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا' اور ہر ایک خود کو فاتح قرار دیتا تھا۔ اس سلسلہ میں ہر ایک یہ کوشش کرتا تھا کہ اسے مناظرہ کے آخر میں بولنے کا موقع دیا جائے تاکہ اس کے مخالف کو اس کا جواب دینے کا موقع نہیں ملے' اور اس سے فائدہ اٹھا کر وہ یہ اعلان کر دے کہ اس نے اپنے حریف کو زیر کر لیا ہے۔

عام طور سے اس قسم کے مناظروں اور مباحثوں میں دلائل کی بنیاد علمی نہیں ہوا کرتی تھی بلکہ دونوں کوشش کرتے تھے کہ مذاق' استہزا' طنز اور لطیفوں کے ذریعہ اپنے حریف کو لاجواب کر دیں۔ جن مقبول عام موضوعات پر بحث ہوتی تھی وہ حضرت عیسٰی کی روحانیت' تثلیث کا عقیدہ' بائبل میں تحریف و اضافے' کائنات کی تخلیق' ویدوں' قرآن اور بائبل کے الہٰی ہونے کا ثبوت' اور نجات حاصل کرنے کے طریقے۔

ویسے تو لاتعداد مناظرے مسلمانوں' عیسائیوں' اور ہندوؤں کے درمیان ہوئے مگر کچھ ایسے مناظرے ہیں کہ جن کی تفصیلات مشہور علماء کی سوانح عمریوں میں یا اس زمانہ کے پمفلٹوں میں مل جاتی ہیں' اسی قسم کا ایک مناظرہ ۱۸۷۰ء میں چاند پور میں ہوا اور "میلہ خدا شناسی" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں مسلمان' عیسائی اور ہندو مبلغین نے حصہ لیا۔ مسلمانوں کی جانب سے مولانا قاسم نانا توی (وفات ۱۸۷۹) اور مولانا محمود الحسن نے مباحثہ میں شرکت کی۔

ایک جرمن مشنری مبلغ کارل پھانڈر کے ساتھ جو مناظرے ہوئے انہوں نے پورے ہندوستان میں بڑی شہرت حاصل کر لی تھی' اور اس کے مد مقابل کے طور پر مولانا رحمت اللہ عثمانی کا نام آتا ہے جنہوں نے ہر بار اسے لاجواب کر دیا' کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۸۵۴ء میں آگرہ میں اس بری طرح شکست خوردہ ہوا کہ اس کے بعد وہ ہندوستان چھوڑ کر چلا گیا۔

اس طرح ہندو مبلغوں کے ساتھ بھی مناظرے ہوتے تھے جن میں ہر بار علماء اپنی فتح کا اعلان کرتے تھے' ان ہی میں سے ایک مناظرہ پنڈت دیانند سرسوتی کے ساتھ ہوا کہ جس میں وہ وعدہ کے باوجود شریک نہیں ہوا' اور اس طرح اس نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔ جب مناظروں کا سلسلہ شروع ہوا تو مسلمانوں کے فرقوں کے علماء بھی ایک دوسرے سے بحث کرنے سے باز نہیں رہے' ان مناظروں میں سب سے مشہور وہ ہے کہ جس میں مولانا اسماعیل شہید (وفات ۱۸۳۱) اور مولانا فضل حق خیر آبادی (وفات ۱۸۶۱) کے درمیان ہوا' موضوع اس کا تھا "امکان نذیر" یعنی کیا خدا رسول اللہ جیسا پیغمبر پیدا کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس مناظرہ نے دلی کی فضا میں کافی تلخی اور کشیدگی پیدا کی' اگرچہ کسی کی واضح فتح تو ثابت نہیں ہوئی مگر دونوں کے حامی اپنے راہنما کو برتر ثابت کرتے رہے۔ آگے چل کر یہ مناظرے دیو بندیوں' اہل حدیث' اور بریلویوں کے درمیان بھی زور شور سے ہوئے۔

مناظر کے اس سلسلہ نے معاشرہ پر گہرے اثرات ڈالے۔ پہلی مرتبہ مذہبی بحثوں میں عام لوگوں کو شریک کیا گیا' جس کی وجہ سے ان کا مذہبی شعور بیدار ہوا اور ساتھ میں انہیں اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ مناظرہ کی حیثیت بہت جلد ایک مقبول ادارے کی ہو گئی کیونکہ سیر و تفریح کے کم مواقع کی وجہ سے عوام کے لئے مناظرہ ایک ایسا

موقع ہو گیا کہ وہ اس میں ذوق و شوق سے شرکت کر کے مقرروں کی خطابت سے

محظوظ ہوتے اور ان کے لطیفوں و فقرہ بازیوں سے لطف اٹھاتے۔ اس سے علماء کا معاشرہ میں اثر و رسوخ بڑھ گیا کیونکہ مسلمان عوام میں یہ احساس ہوا کہ علماء ان کے مذہب کا دفاع کر کے خود ان کا دفاع کر رہے ہیں' لہٰذا وہ علماء کو اپنا نمائندہ سمجھنے لگے اور اس کام کو کرنے کی وجہ سے ان کی عزت پہلے سے زیادہ کرنے لگے۔ اس کے بعد سے علماء کے لئے یہ مشکل نہیں رہا کہ وہ لوگوں سے چندہ کی زیادہ سے زیادہ اپیل کریں۔ اب اس نیک کام میں مسلمان امراء بھی حصہ لینے لگے۔

اس کے ساتھ ہی مناظروں کی وجہ سے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان تناؤ بھی پیدا ہوا اور اس تناؤ نے بعد میں فرقہ وارانہ حالات کو پیدا کیا' اور خصوصیت سے ہندو مسلمان معمولی سے مذہبی معاملات پر ایک دوسرے سے شدت سے لڑائی جھگڑا کرنے لگے

مناظروں کا سلسلہ اس وقت کم ہونا شروع ہوا جب چھاپہ خانہ کے قیام کی وجہ سے مذہبی تبلیغی لٹریچر بڑی تعداد میں چھپنے لگا اور لوگوں کو یہ مواد گھر بیٹھے ملنے لگا' اس کے ساتھ ہی جب یورپی تعلیم یافتہ طبقے میں اضافہ ہونا شروع ہوا تو انہوں نے ان مذہبی جھگڑوں سے خود کو دور رکھا اور اس کے مقابلہ میں سیکولر خیالات کی تبلیغ کی' اس لئے آہستہ آہستہ یہ روایت ختم ہوتی چلی گئی اور آخر میں جب سیاسی تحریکیں شروع ہوئیں تو انہوں نے لوگوں کی توجہ مذہب سے ہٹا کر سیاسی معاملات کی طرف کر دی' کیونکہ سیاسی مسائل میں ہر مذہب و عقیدے سے فرد کو دلچسپی تھی' اس لئے اس نے سیاسی سرگرمیوں کو مذہب سے زیادہ ضروری سمجھا اور اس میں بھرپور حصہ لینے لگا۔

علماء اور وعظ

مذہبی موضوعات پر وعظ مسلمانوں کے معاشرہ میں ایک پرانی روایت ہے۔ اکثر وعظ مسجدوں میں نماز سے پہلے یا بعد میں دیئے جاتے تھے۔ ان وعظوں کی ایک خصوصیت یہ ہوتی تھی اور اب بھی ہے کہ ان میں قرآن و حدیث سے حوالہ دیئے جاتے تھے تاکہ لوگوں کو متاثر کیا جا سکے' اور وعظ کو اس کے ذریعہ سے قبولیت مل سکے۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ ان وعظوں میں مسلمانوں کو مذہبی تعلیمات پر عمل کرنے کو کہا جاتا تھا اور اس بات سے روکا جاتا تھا کہ وہ مذہب کے خلاف اپنی زندگی میں کوئی عمل کریں۔

ماضی میں یہ بھی دستور تھا کہ حکمران اور امراء علماء کو اور مشہور خطیبوں کو اپنے گھروں پر مجلسوں میں بلایا کرتے تھے اور ان سے وعظ سنا کرتے تھے تاکہ اس طرح سے وہ اپنے مذہبی لگاؤ اور اپنی پرہیزگاری کو لوگوں پر ثابت کریں' اور لوگوں میں ان کے بارے میں یہ تاثر ابھرے کہ وہ نیک اور مذہبی امور کی پابندی کرنے والے ہیں۔ وعظوں کو ان مجلسوں میں علماء کو یہ موقع ملتا تھا کہ وہ اپنے سامعین سے مخاطب ہو کر ان کی برائیوں اور ان کی لغزشوں پر انہیں ٹوکیں اور تنبیہہ کرتے ہوئے کہ وہ دنیاوی معاملات میں زیادہ نہ ملوث ہوں' انہیں راہ راست پر لانے اور مذہبی تعلیمات پر عمل کرنے کو کہتے تھے۔ علماء کو جب ایک مرتبہ ممبر پر چڑھنے اور بولنے کا موقع ملتا تھا تو وہ خود کو سامعین سے زیادہ برتر سمجھتے تھے' اور انہیں جس طرح سے چاہتے تھے مخاطب ہوتے تھے' چونکہ اس قسم کی کوئی روایت نہیں تھی کہ وعظ کے دوران یا بعد میں اس پر تنقید کی جائے' سوالات پوچھے جائیں' یا واعظ کو چیلنج کیا جائے' اس لئے

سامعین خاموشی سے وعظوں کو سنا کرتے تھے' اور اسے مذہبی طور پر ثواب گردانتے تھے۔ اسی ذہنیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے واعظ اپنے سامعین کو برا بھلا کہتا تھا۔ ان کی بدعنوانیوں کا ذکر کرتا تھا اور ان کی غیرمذہبی باتوں پر انہیں ٹوکتا تھا۔

اگرچہ وعظ کے موضوعات بدلتے رہتے تھے مگر ان کا تعلق اکثر مذہبی امور اور معاملات سے ہوا کرتا تھا' اور ان میں دنیا کی بے ثباتی' دنیاوی معاملات میں لوگوں کا زیادہ دلچسپی لینا' نماز' روزہ' اور دیگر مذہبی معمولات سے روگردانی کرنا ان کے محبوب موضوعات تھے۔ وہ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ لوگوں نے مذہب کی تعلیمات کو بگاڑ کر اسے خراب کر دیا ہے۔ لہٰذا اسلام کی خالص روح کو دوبارہ سے لانے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان میں جب مغلوں کا زوال ہوا' اور ان کے ہاتھ سے سیاسی طاقت جانا شروع ہوئی تو مسلمانوں نے اسے اپنا زوال قرار دیا' لہٰذا اس موقع پر علماء کو زوال کا موضوع ہاتھ آگیا اور انہوں نے ان کے زوال کا سبب مذہب سے دوری کو بتایا اور اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ اگر وہ مذہب کو ہندووانہ رسومات سے پاک کرلیں تو ان کی زندگیوں میں تبدیلی آسکتی ہے۔ اس قسم کی تبلیغ کرنے والوں میں سید احمد شہید اور ان کے پیرو کار پیش پیش تھے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ان وعظوں میں اس قدر تاثیر ہوتی تھی کہ وہ جہاں جہاں جاتے تھے لوگوں کا جم غفیران کے وعظ سننے کے لئے جمع ہو جاتا تھا۔ خاص طور سے اسماعیل شہید اس طرح سے بولتے تھے کہ لوگ وعظ سنتے ہوئے زار و قطار روتے تھے۔

لوگوں کو جو دوسرے موضوعات پسند تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ کیوں اس دنیا میں دولت جمع کرنے کی فکر میں رہتے ہیں' اور زیادہ دولت جمع کرنا خرابی کی طرف

لے جائے گا ظاہر ہے کہ یہ باتیں ان لوگوں کو پسند آتی تھیں جو محروم تھے اور جن کے پاس دولت نہیں تھی' سید احمد شہید اور ان کے ساتھی اس طرح سے دولت مندوں کو برا کہہ کر انہیں ایک لحاظ سے اس پر آمادہ کرتے تھے کہ وہ اپنی دولت کا صحیح استعمال ان کی مدد کر کے کریں۔ بعد میں ان کے وعظوں میں پنجاب میں سکھوں کی حکومت اور اس کی خرابیوں کے بارے میں تفصیلات آنے لگیں' اور مسلمانوں کو وہ اس پر آمادہ کرنے لگے کہ وہ سکھوں کے خلاف جہاد کریں اور اپنے مسلمان بھائیوں کو ان کے ظلم و ستم سے نجات دلائیں' اور وہاں اسلامی حکومت قائم کر کے شریعت کو نافذ کریں۔

چنانچہ اس دور میں جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں آہستہ آہستہ اپنے اقتدار کو بڑھا رہی تھی' اس وقت وعظ کا سننا لوگوں میں بڑا مقبول ہو گیا تھا' ہر مسجد میں واعظ مذہب کے بارے میں وعظ کہتے اور اپنے سامعین کے مذہبی جذبات کو ابھارتے اور معاشرہ کے تمام مسائل کا حل مذہبی تعلیمات میں ڈھونڈتے۔ چنانچہ اس طرح سے سیاسی انتشار کے اس عہد میں عالم اور واعظ انتہائی اہم ہو گئے' جو اپنے زور خطابت اور زبان کی خوبی سے لوگوں کو متاثر کرتے تھے۔

اس طرح سے وعظ بھی ایک قسم کی تفریح بن گیا تھا' اور لوگ اس سے لطف ضرور اٹھاتے تھے مگر وعظ ان کی زندگیوں میں یا ان کے نقطہ نظر سے کوئی تبدیلی نہیں لا سکا' نہ تو وہ زوال کے اسباب کو کچھ سکے' اور نہ مسلمانوں کی اس پر آشوب دور میں صحیح راہنمائی کر سکے۔ اس لئے وعظ کا سننا محض ثواب حاصل کرنے تک محدود رہا۔

علماء اور فتویٰ

مسلمان ریاست میں مفتی کی یہ ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ قرآن و حدیث کی

روشنی میں قاضی کی راہنمائی کے لئے مختلف سیاسی و سماجی و معاشی امور پر فتوے

جاری کرے۔ لہٰذا جب مغل حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی جگہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اقتدار مل گیا تو ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ دشواری پیش آئی کہ وہ اپنی راہنمائی کے لئے کس طرح سے فتویٰ حاصل کریں۔ اگرچہ کمپنی اپنے ابتدائی دور حکومت میں مغل سلطنت کے ڈھانچہ کو برقرار رکھا تھا اور اپنی ملازمت میں مفتیوں کو رکھا تھا مگر بعد میں آہستہ آہستہ انہوں نے اینگلو سیکسن قانون کو نافذ کر کے شریعت کو ختم کر دیا۔

اس صورت حال میں علماء نے آزادانہ طور پر مسلمانوں کی راہنمائی کے لئے فتوے دینے کا طریقہ شروع کر دیا' لیکن اس میں ایک خرابی یہ تھی کہ مختلف مکاتیب فکر کے علماء ہر مسئلہ پر علیحدہ فتوے دیا کرتے تھے اور اس طرح ایک دوسرے سے ان کا اختلاف ہوا کرتا تھا اور علماء کی اسی تقسیم نے مسلمانوں کو بھی کئی جماعتوں اور حصوں میں بانٹ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک فرقہ کے لئے جو چیز قانونی تھی دوسرے کے لئے وہ حرام یا غیر قانونی بن گئی' اور اس کے بعد ایک فتویٰ کا جواب دوسرے فتویٰ سے دیا جانے لگا کہ جس نے ایک عام مسلمان کو پریشان کر دیا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے۔

اس کے بعد دوسری روایت یہ شروع ہوئی کہ ہر عالم نے اپنے فتویٰ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اسے حجاز کے علماء کے پاس بھیجنا شروع کر دیا' جو کہ ہر فتویٰ کو بغیر تصدیق کئے اس پر اپنی مہر ثبت کر دیتے تھے' اور اس بنیاد پر اس فتویٰ کے صحیح ہونے کا ہندوستان میں پروپیگنڈہ کیا جاتا تھا۔ اس لئے اس طرح سے فتویٰ جاری کرنے کی وجہ سے مسلمان معاشرے میں انتشار پیدا ہو گیا اور عام لوگوں کے لئے یہ مشکل ہو گیا کہ وہ ان فتووں کی روشنی میں کوئی صحیح فیصلہ کر سکیں۔

لیکن اس دوران میں جس قسم کے فتوے جاری ہوئے ان سے اس عہد کے سیاسی و سماجی اور معاشی حالات کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کس تیزی سے بدل رہا تھا اور علماء کے لئے ان تبدیل ہوتے ہوئے حالات کو سمجھنا کس قدر دشوار ہو رہا تھا۔ مثلاً کمپنی کے ابتدائی زمانے میں جب یہ سوال اٹھایا گیا کہ کیا ہندوستان دارالحرب ہے یا دارلامان' تو مولانا عبدالعزیز (وفات ۱۸۲۴) نے یہ فتویٰ دیا کہ اگرچہ اب ہندوستان مسلمانوں کے لئے دارالحرب بن گیا ہے' مگر ان کے لئے یہاں سے ہجرت کرنا فرض نہیں ہے۔ اس کے بعد ایک اور فتویٰ میں انہوں نے کہا کہ دارالحرب میں سود وصول کرنا اور دینا دونوں جائز ہو جاتے ہیں۔

علماء کی اہمیت اس وقت اور بڑھ گئی جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی عدالتیں قائم کر لیں اور مقدمات کا فیصلہ ان عدالتوں میں ہونے لگا' ان حالات میں علماء نے اس بات کی کوشش کی مسلمان اپنے جھگڑوں اور معاملات کا فیصلہ ان سے کرائیں اور انگریزی عدالتوں سے رجوع نہیں کریں۔ اس لئے مسلمانوں نے ہدایات کے لئے علماء کی جانب رخ کرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ جن معاملات میں ان سے استفسار کیا جاتا تھا ان کا تعلق عقائد' رسومات' شادی بیاہ و طلاق کے مسائل' جائداد کے جھگڑے' کافروں کے ساتھ روابط' مرتد اور باغیوں کے ساتھ تعلقات' جائیداد کی خرید و فروخت' اور سیاسی حالات اور ان سے متعلقہ سماجی مسائل ہوا کرتے تھے۔

ان مسائل کے حل کے لئے اور سوالات کا جواب دینے کے لئے تمام مشہور علماء نے دارالافتاء قائم کئے کہ جہاں سے خط و کتابت یا زبانی وہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو مذہب کی روشنی میں ہدایات دیا کرتے تھے' اور فتویٰ جاری کرتے تھے' جب چھاپہ خانہ قائم ہوا تو ان کے فتویٰ چھپنا شروع ہو گئے اور ان کی سرکولیشن بھی

بڑھ گئی۔ اس لئے تمام مشہور علماء نے اپنے فتاویٰ کو کتابی شکل میں چھاپنا شروع کر دیا

تاکہ ان کے ذریعہ اپنے سماجی و معاشی اور دوسرے معاملات میں ہدایات لے سکیں۔

ہندوستان میں سیاسی آزادی کی جدوجہد کے دوران علماء بہت زیادہ سرگرم ہو گئے اور سیاسی مسائل پر انہوں نے فتویٰ دینا شروع کر دیئے' اس نے مزید اور الجھن پیدا کی' کیونکہ ایک طرف دیو بند کے علماء کا فتویٰ تھا کہ ہندوستان دارالحرب ہے' اس لئے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے ہندوؤں سے تعاون کرنا چاہیے' اس لئے ان کے پیروکاروں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی۔ اور غیر ملکی حکومت کے خلاف ہر تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔

دیوبند کے علماء کے اس رویہ کی احمد رضا خاں نے مخالفت کی اور انہوں نے ہندوستان کو دارالامن قرار دیا کیونکہ یہاں پر مسلمانوں کو پوری مذہبی آزادی تھی اس لئے انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ تعاون کی ممانعت کی' اور خلافت تحریک میں بھی یہ علیحدہ رہے اس طرح سے جب دیو بند کے علماء نے ہندوستان میں ایک قومی نظریہ کی حمایت کی تو مسلم لیگ کے علماء نے دو قومی نظریہ کو جائز قرار دیتے ہوئے فتویٰ دیا' اور یہ دلیل دی کہ چونکہ ہندوستان دارالسلام نہیں بن سکتا ہے اس لئے پاکستان کا قیام ضروری ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد بھی علماء کے فتوے و منے کا سلسلہ جاری ہے اور اب تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا ہے کہ جمہوریت اسلامی ہے یا نہیں۔ بنکنگ سسٹم اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہے یا نہیں۔ کثیر جماعتی نظام اسلام سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں' اور اسلام میں مذہبی اقلیتوں کو کون سے حقوق مل سکتے ہیں؟ اس صورت حال میں سیاست سے زیادہ مذہب کی اہمیت ہو گئی ہے۔

حالانکہ دانش مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ مسائل کو صرف سیاسی بنیادوں پر حل کیا جائے' اور اس میں ملک و قوم کے مفاد کو پیش نظر رکھا جائے۔ معاشی معاملات کو آج کل کے معاشی نظریات و افکار کی روشنی میں حل کیا جائے' اگر ان مسائل کو مذہب کی روشنی اور فتووں کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے اور انتشار پھیلے گا۔

دیکھا جائے تو فتویٰ علماء کے ہاتھ میں ایک خطرناک ہتھیار ہے اور اکثر اس کا غلط استعمال ہوتا ہے۔ وہ آسانی کے ساتھ اپنے مخالفین کو کافر قرار دے دیتے ہیں اور ان کے نکاح توڑنے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اس کے استعمال سے وہ لوگوں کے مذہبی جذبات کو اشتعال دلاتے ہیں اور اپنی حاکمیت کو قائم کرتے ہیں۔ عیسائیوں میں پوپ کو یہ اختیار ہے کہ وہ چاہے تو کسی کو عیسائیت سے خارج کر دے' لیکن ہمارے ہاں ہر عالم اپنے فتویٰ کے ذریعہ کسی کو بھی کافر قرار دے سکتا ہے اور اس کے قتل کا بھی فیصلہ صادر کر سکتا ہے۔

علماء اور تعویذ

قدیم زمانہ میں بہت سے معاشروں میں تحریری حروف اور اعداد کو جادوئی سمجھا جاتا تھا' اور یہ اعتقاد تھا کہ ان میں اس قدر طاقت ہوتی ہے کہ یہ بیماریوں کو دور کر سکتے ہیں' اور ان کے ذریعہ سماجی اور مالی مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس عقیدے پر آگے چل کر تعویذ مقبول ہوئے اور علماء و روحانی علوم کے ماہروں نے تعویذ تیار کرنے کا سلسلہ شروع کیا کہ جو درخواست گزار کی ضروریات کے مطابق ہوتا تھا اور اس کے لئے بطور تریاق کام آتا تھا۔

ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ تعویذ دینے کا کام صرف ان لوگوں کا ہے کہ جو خاص

صلاحیتیں رکھتے ہوں' اس لئے علماء نے اس پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی کیونکہ ان کی اپنی دلیل کے مطابق وہ اپنی مذہبی قابلیت اور روحانی صلاحیت کی وجہ سے اس قابل ہیں کہ تعویذ دے سکیں' اور صرف ان ہی کے دیئے ہوئے تعویذ میں اثر ہوتا ہے۔ اس لئے بعض علماء اور ان کے خاندانوں نے خاص خاص بیماریوں یا مسائل کے بارے میں تعویذ دینے میں اپنا مقام حاصل کر لیا تھا' اور جب تک وہ اجازت نہیں دیتے تھے کوئی بھی یہ تعویذ دینے کا اہل نہیں تھا۔ اس طرح سے ایک طرف تو تعویذ دینے کے کام کی وجہ سے علماء اور ان کے خاندانوں کا اثر و رسوخ بڑھا' دوسرے ان کے لئے مستقل مالی آمدنی کا ذریعہ بھی ہو گیا۔

ہندوستان اور پاکستان میں اس عقیدے کی جڑیں بڑی گہری ہیں کہ تعویذ بیماریوں' مسائل' اور پریشانیوں کا سب سے بڑا حل ہے' اس سلسلہ میں پڑھے لکھے اور جاہل کی کوئی قید نہیں بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ تعویذ کے ذریعہ وہ اپنے مسائل پر قابو پا لیں گے' اس یقین کی وجہ سے تعویذ دینے والے عامل کو معاشرہ میں ایک خاص روحانی مقام مل گیا' اور ساتھ ہی میں یہ اس کی آمدنی کا ایک ذریعہ بھی بن گیا' اگرچہ وہ اس کو فیس کے بجائے ہدیہ کا نام دیتا ہے تاکہ اس کی وقعت لوگوں کی نظروں میں گرے نہیں' اور اس کے ساتھ ایک تقدس وابستہ رہے۔

چھاپہ خانہ کی ایجاد کے بعد بہت سے علماء نے تعویذوں کی کتابیں چھاپنا شروع کر دیں تاکہ اس طرح سے وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک جا سکیں اور یوں ان کی آمدنی کتابوں کی فروخت سے ہونے لگی۔ لیکن اکثر لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس تعویذ میں

زیادہ اثر ہوتا ہے جو براہ راست کسی عامل سے حاصل کیا جاتا ہے بالمقابلہ اس کے جو کتاب سے نقل کیا جاتا ہے

لیکن تعویذوں پر مبنی جو کتابیں چھپی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں لوگوں کے کیا مسائل ہیں' اور وہ کیوں ان کا حل تلاش کرنا چاہتے ہیں' اکثر تعویذ عام بیماریوں کے بارے میں ہوتے ہیں جن میں آنکھوں اور دانتوں کا درد' بخار' خسرہ' چیچک وغیرہ شامل ہیں۔ دوسری قسم کے وہ تعویذ ہیں کہ جو تجارت میں منافع کا باعث بنتے ہیں' ان میں سے اکثر ایسے تعویذ ہیں کہ جو دولت مند بنانے میں مدد کرتے ہیں' اور کچھ ایسے ہیں کہ جن سے پوشیدہ اور دفن شدہ خزانے دریافت کرنے میں مدد ملتی ہے۔

تیسری قسم مین عورتوں کے مسائل آتے ہیں کہ کس طرح سے محبوب کی محبت حاصل کی جائے' یا مرد کس طرح سے عورت کو اپنی طرف مائل کرے' اس سے کس طرح ملاقات کرے' اور کس طرح اسے حاصل کرے' اس حصہ میں وہ تعویذ بھی ہوتے ہیں کہ جن میں بیویاں اپنے شوہروں کی محبت حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتی ہیں' اور ان کے ذریعہ اپنے رقیبوں پر غلبہ حاصل کرتی ہیں۔

تعویذوں کے ان مجموعوں میں مردوں کی نامردی کے بارے میں بھی تعویذ ہوتے ہیں اور یہ استعمال بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنی نامردی کسے ختم کریں' کس طرح زیادہ جنسی لذت حاصل کریں' اور کس طرح اپنی مردانگی سے عورت کو قابو میں کریں۔

اس قسم کے تعویذوں کا ایک مجموعہ مشہور عالم احمد رضا خاں بریلوی (وفات ۱۹۱۵) کا ہے جس کا عنوان ہے "شمع شبستان رضا" اس میں بیماریوں اور سماجی و معاشی مسائل کے تعویذوں کے علاوہ اس قسم کے تعویذ بھی ہیں کہ کرکٹ میچ کیسے جیتا

جائے؟ اس کتاب کے ایڈیٹر نے اس تعویذ کے بارے میں بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ



ایک مرتبہ میرٹھ اور بریلی کے دو اسکولوں کے درمیان کرکٹ میچ ہوا کیونکہ بریلی کی ٹیم کمزور تھی اس لئے اس کے میچ جیتنے کی کوئی توقع نہیں تھی جب کچھ لوگوں نے اس سلسلہ میں احمد رضا خاں سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ ٹیم میچ سے پہلے ایک دعا پڑھے' جو ان کو میچ میں فتح دلائے گی' چنانچہ یہ عمل کامیاب ہوا اور بریلی کی ٹیم جیت گئی- یہ عمل ان کے مجموعہ میں موجود ہے اور کرکٹ میں جتنے کے لئے شاید آج بھی باعمل ہو- پاکستانی کرکٹ ٹیم کو اس سے فائدہ اٹھنا چاہیے-

اس کے علاوہ اس میں اس قسم کے تعویذ بھی ہیں کہ دشمنوں کو کیسے قتل کیا جائے؟ اور ان پر کس طرح سے قابو پایا جائے؟

اگرچہ تعویذوں کے بارے میں علماء پر اختلاف بھی ہیں' اور کچھ علماء اس کے قائل نہیں کہ تعویذوں کا استعمال کیا جائے' مگر تعویذوں کا استعمال ان حالتوں میں بڑھ جاتا ہے جب معاشرتی' سماجی' اور معاشی مسائل کا کوئی حل نظر نہیں آئے- خاص طور سے دیہاتی علاقوں میں کہ جہاں لوگوں کو علاج و معالجہ کی سہولتیں نہیں ہیں اور نہ ہسپتال ہیں' نہ حکیم و ڈاکٹر' ان حالات میں تعویذ اور عامل ان کے لئے آخری سہارا ہوتے ہیں' اسی لئے پاکستان میں گاؤں دیہاتوں کی عمارتوں کی دیواروں پر عاملوں کے اشتہارات ہوتے ہیں کہ جو ہر مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں- اس لئے شادی و بیاہ کی کامیابی' لڑکے کی پیدائش' ناراض شوہر کی خوشنودی' اور مستقبل کی خوش حال زندگی کے لئے ان عاملوں کی طرف رجوع کرتے ہیں-

آئندہ یہ تو ممکن ہے کہ لوگ بیماریوں کے لئے ڈاکٹروں یا نیم حکیموں کے پاس جانے لگیں مگر سماجی و معاشی مسائل کا حل نہ ہونے کی وجہ سے ایسا نظر آتا ہے کہ تعویذوں کا اثر دیر تک قائم رہے گا-

علماء اور جدیدیت

مسلمان معاشرہ میں اگرچہ علماء کا طبقہ اپنی خصوصیات اور کردار کی وجہ سے وجود میں آ چکا ہے مگر اس کے باوجود وہ اپنے لئے کوئی ایک ایسا ادارہ پیدا نہیں کر سکے جیسا کہ عیسائیت میں چرچ کا ہے۔ اس لئے وہ اس بات پر مجبور ہوئے کہ اپنے نظریات کے نفاذ کے لئے ریاست کی حمایت حاصل کریں' اس طرح سے وہ ریاستی ڈھانچہ کا ایک حصہ بن گئے اور حکمراں طبقوں کے مفادات کا تحفظ ان کے لئے ضروری ہو گیا۔ لہٰذا وہ ریاستی اقتدار کے قائم رکھنے کے لئے قائم شدہ روایات و اداروں کے حامی ہو گئے اور معاشرہ میں ہونے والی تبدیلیوں کی شدت سے مخالفت کی۔ لہٰذا عربی لفظ بدعت جس کے معنی تبدیلی کے ہیں وہ منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں جب کہ شام و عراق اور ایران فتح ہوئے تو نئے ہونے والے مسلمان اپنے ساتھ اپنی آبائی اور قدیم روایات کو ساتھ لے کر آئے،



اس موقع پر بھی علماء نے اس بات کی شدت سے مخالفت کی کہ نئے ثقافتی اور سماجی قدروں کو اسلامی معاشرے میں ضم کیا جائے' اور اس بات کی حمایت کی کہ عرب ثقافت کو جس کو وہ اسلامی کہتے تھے' اس کی خالصیت کو برقرار رکھا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام دانشور کہ جو روشن خیال اور لبرل نظریات رکھتے تھے' انہیں زندیق یا مانی اور مزدک کے پیروکار کہہ کر یا تو قتل کر دیا گیا یا ان کی زبان بندی کر دی گئی' انہیں میں سے ابن مقفع تھا' جو کہ مجوسی سے مسلمان ہوا تھا' اور جس کو عربی زبان پر اس قدر مہارت تھی کہ وہ اہل زبان کی غلطیاں نکالا کرتا تھا' علماء کے اس رویہ کی وجہ سے اسلام کے ابتدائی دور ہی میں ذہنی طور پر مسلمان معاشرہ کو پھیلنے نہیں دیا گیا اور اسے ایک دائرے میں محدود کر دیا۔

تبدیلی اور جدیدیت کی اس مخالفت کی وجہ سے علماء اور دانشوروں میں ایک ایسا تصادم شروع ہوا کہ جو پوری اسلامی تاریخ میں جاری رہا' اور آج بھی جاری ہے۔ چونکہ وہ حکومت کے انتظامیہ کا ایک حصہ تھے' اس لئے انہوں نے افرادی شخصیات اور تحریکوں کو جو تبدیلی لانا چاہتی تھیں ہمیشہ کچل کر رکھ دیا۔ مثلاً معتزلہ کی تحریک اس وقت تک محفوظ رہی جب تک کہ خلیفہ مامون نے اس کی حمایت کی' مگر جیسے ہی یہ ریاست کی حمایت سے محروم ہوئی' علماء نے اس تحریک کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

اسلامی معاشرہ میں چند روشن خیال اور روایات کے باغی' مثلاً ابن سینا' ابن رشد' اور رازی اس لئے بچ گئے کہ انہیں حکمرانوں کی یا با اثر افراد کی حمایت حاصل تھی ورنہ علماء تو ان کے خلاف فتویٰ دے چکے تھے۔ ہندوستان میں وہی کچھ ابو الفضل اور اس کے خاندان کے ساتھ ہوا' کہ جن کی جانوں کے درپے علماء تھے اور اس کی وجہ محض یہ تھی کہ ان کے مذہبی نظریات ان سے مختلف تھے۔ ان کی جان اس وجہ

پالیسی کو ایران میں رضا شاہ اور افغانستان میں امیر حبیب اللہ نے شروع کرنے کی کوشش کی' مگر ایک تو ان دونوں شخصیات میں مفاد پرستی تھی' اور پھر علماء کی مخالفت کے آگے یہ نہیں ٹھہر سکے اور ان کی اصلاحات بہت جلد ختم ہو گئیں۔

مغربیت

مسلمان ملکوں میں جدیدیت کو مغرب سے منسوب کر دیا جاتا ہے اور اس طرح اس کی مخالفت کی کئی وجوہات پیدا ہو جاتی ہیں' کیونکہ اکثر مسلمان ممالک مغربی ملکوں کی نو آبادی رہے اور اس دوران میں ان کا مقامی کلچر اور روایات نو آبادیاتی عمل میں بری طرح سے متاثر ہوئیں' اس لئے مغرب کی جانب نو آبادیاتی عوام کا رویہ انتہائی مخالفانہ ہو گیا' اور وہ اسے ہر لحاظ سے اپنا دشمن سمجھنے لگے۔ لہٰذا آزادی کے بعد بھی ان ملکوں میں مغرب دشمنی کے جذبات عام رہے' ان جذبات کو بھڑکانے اور ہوا دینے میں حکمراں طبقوں کا بھی ہاتھ رہا' کیونکہ اس طرح سے وہ جمہوریت' لبرل ازم' اور ترقی پسند خیالات و نظریات کو روک کر آمرانہ طرز حکومت کو جائز قرار دیتے رہے۔

علماء نے بھی مغرب کی مخالفت میں اس لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کیونکہ اس عمل کے دوران ان کی سماجی اور معاشی حیثیت متاثر ہوئی تھی' اس لئے انہوں نے مغرب کی مخالفت میں ایک خاص نقطہ نظر کو اختیار کیا اور مغربی تہذیب و ثقافت اور مغربی نظریات کو بحیثیت اجنبی کے پیش کیا کہ جو مسلمان معاشرہ کی روایات کے خلاف ہے' اس طرح انہوں نے جمہوریت' لبرل ازم' اور سیکولرازم کو اسلام کا دشمن بنا کر اس کے خلاف پروپیگنڈہ کیا اور اس کے رشتے الحاد سے ملا دیئے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے مذہبی جذبات کو ابھار کر مغرب کے ترقی پسند نظریات کو روک دیا جائے۔

اس طرح سے مخالفت میں ان کے اور حکمراں طبقوں کے خیالات ایک جیسے ہو گئے اور اس سے آمرانہ حکومتوں کو مستحکم ہونے میں مدد مل گئی۔

اس کے علاوہ علماء نے مغربی تہذیب کو غیر اخلاقی قرار دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ ان کے معاشرہ میں عورتوں اور مردوں کے درمیان کوئی تمیز باقی نہیں رہی اور جنسی میل ملاپ نے ان میں فاشی و عریانی کو فروغ دیا' ایک مغربی عالم عبداسلام نے مغربی تہذیب پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ "انہوں نے زنا کاری' الحاد' فاشی و عریانی' حمل گرانا' اور سود کا لینا' جائز و قانونی قرار دے دیا ہے۔ ان کے ہاں ملحد اور ایمان والے میں کوئی تمیز باقی نہیں رہی ہے' اور نہ ہی چرچ کے بنانے والے اور چکلہ بنانے والوں میں کوئی فرق ہے"۔

یہ نقطہ نظر تمام علماء نے اختیار کر رکھا ہے اور مغربی تہذیب کے خلاف ان کا پروپیگنڈہ یہی ہے کہ وہ اخلاقی طور پر گمراہ ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ آزادانہ جنسی اختلاط کو سب سے زیادہ مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ اس سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ جب یہی لوگ مغرب جاتے ہیں اور وہاں صفائی' لوگوں کی ایمانداری' اور ان کا نظم و ضبط دیکھتے ہیں' تو وہ اس کا کریڈٹ مغرب کو دینے کے بجائے یہ دلیل دیتے ہیں کہ اہل مغرب ان اسلامی تعلیمات پر عمل کر رہے ہیں جو کہ مسلمانوں نے چھوڑ دی ہیں۔

اس پروپیگنڈہ کا نتیجہ یہ ہے کہ مغرب زدہ ہونا' یا آزاد خیال ہونا' ہمارے معاشرے میں منفی طور پر استعمال ہوتا ہے' اور اس کو حقارت سے استعمال کیا جاتا ہے' اور جو لوگ مغرب زدہ ہوتے ہیں انہیں معاشرہ سے علیحدہ سمجھا جاتا ہے' اور ایک طرح سے وہ معاشرہ کے غدار ہوتے ہیں کہ جنہوں نے اپنی ثقافت و روایات کو

چھوڑ کر اجنبی' دشمن تہذیب کو اختیار کیا۔ لہٰذا وہ عورتیں جو کہ اپنے حقوق کے لئے جنگ کر رہی ہیں' ان کی جنگ اپنی روایات و اقدار کے خلاف ہے کہ جنھوں نے انہیں غلام بنا رکھا ہے لہٰذا یہ عورتیں "مغرب زدہ خواتین" کہلاتی ہیں' اور اس طرح انہیں معاشرہ کا غدار سمجھ کر ان کے حقوق کی جدوجہد کو روکا جاتا ہے' کیونکہ وہ ان حقوق کا مطالبہ کر رہی ہیں کہ جو ہماری ثقافت و روایات میں نہیں ہیں۔

یہی صورت حال جمہوری نظام حکومت' اور روشن خیال نظریات کی ہے کہ جنہیں علماء مغربی کہہ کر رد کر دیتے ہیں' اور ان میں اور اسلام میں تضادات ڈھونڈتے ہیں' علماء کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر ان نظریات کو اختیار کر لیا گیا تو اس کی وجہ سے ہماری شناخت ختم ہو جائے گی اور ہم ایک ایسی ثقافت میں ضم ہو جائیں گے کہ جو ہمارے لئے اجنبی ہے۔

علماء اور مغربی ٹیکنالوجی

علماء مغربی تہذیب کی مخالفت نظریات و افکار کے تعلق سے تو کرتے ہیں' لیکن جب مغربی ٹیکنالوجی اور اس کی ایجادات کا سوال آتا ہے تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ بھی اسی مغربی تہذیب کی پیداوار ہیں کہ جس کو وہ اپنا دشمن گردانتے ہیں چونکہ ان ایجادات کا تعلق انسانی سہولتوں' آرام' اور آسائشوں سے ہوتا ہے' اس لئے علماء کو ان کے اختیار کرنے پر اب کوئی اعتراض نہیں رہا ہے۔

اگرچہ ہمارے علماء کو یہ پتہ نہیں ہوتا ہے کہ ان سائنسی ایجادات کے پیچھے کون سے عوامل ہیں یا ان کی بناوٹ اور تکنیک کیا ہے؟ مگر یہ ایجادات ان کے لئے اس لئے سودمند ہو گئی ہیں کہ وہ ان کے ذریعہ اپنے خیالات و نظریات کا پروپیگنڈا کرتے

ہیں۔ مثلاً لاؤڈ اسپیکر کہ جسے ابتداء میں حرام قرار دے دیا گیا تھا اب وہی لاؤڈ اسپیکر

علماء کے لئے ایک ایسا آلہ ہے کہ جس کے ذریعہ وہ اپنے وعظوں کو پورے محلے میں زبردستی سناتے ہیں' اس کے ذریعہ جو شوروغل پھیلتا ہے وہ اس لئے جائز ہے کہ وہ اسے مذہب کے لئے استعمال کرتے ہیں اس لئے اس کے خلاف بولنے کی کوئی جرات بھی نہیں کر سکتا ہے۔

کیسٹس اور وڈیو دوسری مغربی ایجادات ہیں کہ جن کو مذہبی جماعتیں اور علماء استعمال کرتے ہیں اب ان کے ذریعہ ان کا پیغام ملک کے کونے کونے میں پہنچایا جاتا ہے۔ ان دونوں کا استعمال ایران میں شاہ کے خلاف ہوا' اور خمینی کے وعظ اور ان کے پیغامات کو ان کے ذریعہ ایرانی عوام تک پہنچایا گیا۔

یورپ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے درمیان اور سماجی و ثقافتی و معاشی نظریات کے درمیان ایک رشتہ ہے' اس لئے وہاں پر نئی ایجادات ان کی بڑھتی' پھیلتی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرتی ہیں ایک ترقی یافتہ معاشرہ میں یہ ایجادات ترقی کی علامتیں بن جاتی ہیں' لیکن ایک پس ماندہ معاشرہ میں یہی ایجادات رجعت پرستوں کے ہاتھوں استعمال ہو کر معاشرہ کو اور زیادہ پس ماندہ بنا دیتی ہیں

اس لئے علماء ایک طرف تو مغربی ایجادات کو اپنی سہولتوں' آسائشوں اور پروپیگنڈے کے لئے استعمال کرتے ہیں' مگر دوسری طرف وہ ان نظریات و افکار اور سیاسی نظام کے مخالف ہیں کہ جنہوں نے مغرب کو نہ صرف سماجی و معاشی بلکہ سائنسی طور پر ترقی یافتہ بنایا' اور اسی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ یہ ایجادات ہو سکیں۔ اگر مغرب کا معاشرہ جمہوری' سیکولر اور لبرل نہیں ہوتا' تو سائنسی طور پر بھی وہ ان ایجادات کو رواج نہیں دے سکتا تھا' کیونکہ چاہے وہ سائنسدان ہو' یا مفکر' تخلیقی کام

کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو رواداری اور آزادی کا ماحول ملے۔

ہمارے علماء کا خیال یہ ہے کہ مغربی نظام زندگی اور سائنس و ٹیکنالوجی دو مختلف چیزیں ہیں اس لئے ایک کو تو رد کر دیا جائے' اور دوسرے کو اختیار کر لیا جائے' لیکن اگر صرف ٹیکنالوجی کو اختیار کیا اور ذہنی ترقی کی طرف توجہ نہیں دی تو یہ ہمارے معاشرہ کو مغرب کا غلام بنا دے گی' اور ہماری اپنی صلاحیتیں دب کر ختم ہو جائیں گی۔

علماء اور سماجی بہبود

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور اقتدار میں، ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ وہ اپنے اپنے مذہب کا دفاع کریں ۔ اس مقصد کے لئے دونوں مذاہب کے عالموں نے ایک طرف تو مذہبی تنظیمیں بنائیں، اور دوسری طرف مناظروں کے ذریعے اپنے مذہب کی سچائی کو ثابت کرنے کا سلسلہ شروع کیا ۔ اگرچہ انہوں نے عیسائی مشنریوں سے یہ تو ضرور سیکھا کہ مذہب کی تبلیغ اور اس کے دفاع کے لئے باقاعدہ منظم ہو کر کام کیا جائے، مگر مشنریوں کے جس پہلو کو انہوں نے نظر انداز کر دیا وہ سماجی بہبود کے کام تھے ۔

مثلاً مشنریوں نے سماجی بہبود کے کام ایک تو اس لئے کئے کہ اس طرح سے وہ لوگوں سے رابطہ قائم کر کے ان کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتے تھے ۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ سماجی بہبود کے کاموں میں تبلیغ کے ساتھ ساتھ انسانی ہمدردیوں کا بھی جذبہ شامل ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے خصوصیت سے تعلیم اور صحت کے سلسلہ میں جو کام کئے

اس کا فائدہ غریبوں کو ہوا کیونکہ اب تک ان دونوں نعمتوں سے صرف امراء ہی فائدہ

اٹھاتے تھے۔

مشنریوں کے سماجی بہبود کے کاموں کی وجہ سے ہندوستان میں روایتی عوامی بہبود کا تصور بری طرح متاثر ہوا' کیونکہ اب تک لوگوں کی مدد ان پر ترس کھا کر کی جاتی تھی اور انہیں جو کچھ بھی دیا جاتا تھا وہ خیرات و صدقے کی شکل میں ہوتا تھا' اس لئے غریب لوگوں کو اپنی غربت اور محتاجی کا احساس ہوتا تھا۔ معاشرہ میں ایسے اداروں کا وجود نہیں تھا کہ جو لوگوں کی خدمت کریں' اور جہاں فرد کی اہمیت نہ ہو بلکہ ادارے کی اہمیت ہو۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عیسائی مذہب کے مذہبی سربراہوں اور مبلغوں کی طرح ہمارے علماء نے سماجی بہبود کے کاموں کی کیوں اہمیت نہیں دی' اور اپنی تمام توانائی کو مذہب کے دفاع اور تبلیغ میں صرف کیا؟ اس کی وجہ تو عیسائیت اور اسلام کی بنیاد میں ہے۔ عیسائیت رومی امپائر کے زیر سایہ پیدا ہوئی' اور اس کو ماننے والے بھی اس دور میں غریب اور مظلوم لوگ تھے۔ اس لئے ان کی بنیاد ہی میں مظلومیت کے احساسات ہیں۔ اس کے برعکس اسلام فتوحات اور طاقت کے سایہ میں پروان چڑھا' اور فاتحین نے لوگوں کو بزور تلوار مسلمان نہیں کیا بلکہ لوگ خود اس لئے مسلمان ہوئے کہ اس میں ان کا فائدہ تھا۔ اس لئے تبلیغ کے سلسلہ میں دونوں کے رویہ میں فرق تھا: عیسائی غریبوں کی خدمت کر کے ان کا دل جیتنا چاہتے تھے' اور مسلمان مبلغین اپنے مذہب کی سچائی ثابت کر کے لوگوں کو اپنی طرف راغب کرنا چاہتے تھے۔

اس لئے مسلمان علماء میں صرف دین کا علم تھا' اور اسی کو وہ بطور پیشہ اختیار کرنا چاہتے تھے' جبکہ اس کے برعکس مشنریوں میں ڈاکٹر' انجینئر' سائنسدان اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے تھے' جو اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں اور مذہب کو یکجا

کر کے لوگوں سے رابطہ کرتے تھے۔ اگرچہ اس کی تقلید کرتے ہوئے اس بات کی کوشش ضرور کی گئی کہ علماء کو کوئی پیشہ سکھایا جائے' مگر اس میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی' مثلاً دیوبند کے ابتدائی دنوں میں وہاں طالب علموں کو مختلف پیشوں میں تربیت دینے کا سلسلہ شروع ہوا' مگر طلباء نے اسے اپنی شان کے خلاف جانا اور اس میں دلچسپی نہیں لی' جس کی وجہ سے یہ سلسلہ ترک کرنا پڑا۔

ہمارے علماء میں دین کے علم کے بعد ایک قسم کی رعونت آ جاتی ہے اور وہ لوگوں کو جاہل اور مذہب سے بیگانہ سمجھتے ہوئے ان سے نفرت کرنے لگتے ہیں' اس لئے ان کے اور لوگوں کے درمیان خلیج بڑھتی رہتی ہے' اور ان کی ساری توجہ اس پر ہوتی ہے کہ لوگوں کو دین کے راستہ پر کیسے لایا جائے' اس مقصد کے لئے وہ قطعی اس راستہ کو اختیار نہیں کرتے کہ جو عیسائی مشنریوں نے اختیار کیا ہے' یعنی سماجی بہبود کے کاموں میں دلچسپی۔

نو آبادیاتی دور سے علماء نے مذہب کے بعد سیاست میں دلچسپی لینا شروع کر دی' کیونکہ ان کا یہ خیال تھا کہ وہ شریعت کا نفاذ اس وقت کر سکتے ہیں کہ جب ان کے پاس طاقت ہو گی۔ اس لئے ابتداء میں تو انہوں نے سیاسی پارٹیوں میں شرکت کی مگر بعد میں اپنی سیاسی جماعتیں بھی بنائیں۔ مذہب اور سیاست کے اس اتحاد میں انہوں نے سماجی بہبود کو بالکل نظرانداز کر دیا۔

پاکستان بننے کے بعد بھی ان دینی اور سیاسی جماعتوں کی یہی پالیسی ہے کہ کس طرح سے اقتدار پر قبضہ کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اسلام خطرے میں ہے کا نعرہ لگا کر لوگوں کے جذبات کو ابھارتے ہیں۔ مگر انہوں نے سماجی بہبود کے ذریعہ' اور لوگوں کی خدمت کر کے ان کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے پس منظر میں جو ذہنیت کام کر رہی ہے وہ یہ کہ علماء خود کو لیڈر اور رہنما سمجھتے

ہیں' اس لئے وہ یہ توقع کرتے ہیں کہ لوگوں کو ان کی خدمت کرنی چاہئے' ان کے لئے قربانی دینی چاہئے' اور ان کی سرپرستی کرنی چاہئے کیونکہ رہنما خود کبھی لوگوں کی خدمت نہیں کرتے۔

مسلم امہ

کسی بھی مسلمان ملک میں معاشرہ جب کبھی کسی بحران سے دو چار ہوتا ہے یا اندرونی و بیرونی خطرات میں گھر جاتا ہے تو اس وقت اس کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ تمام مسلمان ممالک متحدہ ہو جائیں' اور مسلمان اقوام تمام اختلافات کو مٹا کر ایک امہ بن جائیں' اس سلسلہ میں ہمیشہ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ماضی میں مسلمان ایک قوم تھی' اور جب تک وہ متحد رہے دنیا پر حکومت کی' مگر جیسے ہی ان میں اختلافات ابھرے' امہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی' اسی کے ساتھ اس کا زوال بھی ہو گیا اس لئے اگر ماضی کی طرح آج بھی یہ سب مل جائیں اور نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کا شغر ایک ہو جائیں تو دنیا میں انقلاب لایا جا سکتا ہے۔

مسلم امہ اور اس کے اتحاد کے بارے میں ہماری تاریخی غلط فہمیاں ہیں کیونکہ جہاں تک ابتدائی دور میں مسلم امہ کا تعلق ہے' وہ ہمیشہ سے اندرونی طور پر اختلافات کا شکار رہی۔ سیاسی گروہ بندیاں' فرقے' عقائد کا اختلاف' اور سماجی و سیاسی اختلافات



جماعتوں اور گروہوں کو معاشی و سیاسی مفادات نے جکڑے رکھا' مگر جیسے ہی یہ مفادات کمزور ہوئے مسلم امہ کا اتحاد اس کے ساتھ بکھر گیا۔

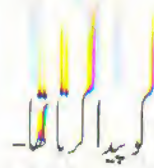
مسلم امہ کا پہلا دور وہ تھا کہ جس میں عربوں کا اتحاد قائم ہوا اور اس طرح قبائلی شناخت کو کمزور کر کے ان میں عرب شناخت کو اسلام کے ذریعہ قائم کیا گیا' لیکن جب شام' عراق اور ایران فتح ہوئے تو یہاں کے مقامی باشندوں نے مسلمان ہونے کے بعد مسلم امہ میں شمولیت کرنی چاہی' مگر اس کی زبردست مخالفت عربوں کی جانب سے ہوئی جو ان لوگوں کو اپنے میں شامل کر کے انہیں برابر کا سماجی مقام دینے پر تیار نہیں تھے' اس وجہ سے عربوں اور غیر عربوں کے درمیان ایک فرق قائم ہو گیا' اور ان غیر عربوں نے جن میں ایرانیوں کی اکثریت تھی عربوں کے خلاف شعوبیہ یا قومیت کی تحریک چلائی۔ جس میں انہوں نے عرب برتری کو رد کرتے ہوئے اپنی ثقافتی شناخت پر زور دیا۔ ایرانیوں میں قومیت کے یہ جذبات اس وقت بھی قائم رہے جب کہ عرب دور حکومت کا عباسی زوال کے ساتھ خاتمہ ہو گیا اور اس کی جگہ ایرانی و ترکی خاندانوں کی حکومتیں قائم ہو گئیں' ایک لحاظ سے ان حکومتوں کے قائم ہونے کے بعد ایرانی قومی تحریک اور زیادہ شدت سے ابھری اور روس نے عربوں کی سیاسی و نسلی برتری کو ختم کر دیا۔

ان جذبات کی عکاسی فردوسی نے شاہنامہ میں کی ہے' جس نے ایران کے قدیم بادشاہوں کی تاریخ کو منظور کر کے ایرانیوں میں تاریخی شعور کو گہرا کیا' اس نے عربوں کی فتح ایران کا ذکر بڑے افسوس اور صدمہ کے ساتھ کیا ہے اسی لئے فردوسی کا شاہنامہ ایران کے طبقہ اعلیٰ کے لئے ایک شاہکار بن گیا جو ان میں قومی و فخر و مباہات

سے بچی رہی کہ اکبر نے انہیں تحفظ فراہم کیا' اور اس کے دربار میں انہیں یہ مواقع ملے کہ وہ اپنے نظریات کا پوری طرح سے اظہار کر سکیں۔ مگر جیسے ہی اکبر کی آنکھیں بند ہوئی۔ لبرل ازم اور ترقی پسندی کے نظریات بھی اس کے ساتھ ختم ہو گئے

علماء نے صرف لبرل اور ترقی پسند خیالات ہی کی مخالفت نہیں کی بلکہ انہوں نے مختلف مذہبی فرقوں کے مذہبی عقائد میں تبدیلی کی بھی مخالفت کی۔ مثلاً ہندوستان میں مہدی جونپوری کہ جنہوں نے اصلاحی اور احیاء کی تحریک شروع کی تھی' اس پر علماء نے شدت سے تنقید کی اور ان کے پیروکاروں پر سخت ظلم و ستم ڈھائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی تحریکیں خفیہ طور پر اپنے نظریات کا پرچار کرنے لگیں' اور اپنی تحریروں کو بھی خفیہ طور پر پھیلانے لگیں۔ مثلاً اخوان الصفا کے مصنفین کہ جنہوں نے عقلیت کا پرچار کیا اور مختلف موضوعات پر لکھا' انہوں نے اپنے نام خفیہ رکھے تاکہ وہ علماء کی مخالفت سے محفوظ رہیں۔

جو ماضی میں ہوا' وہی کچھ آج بھی ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کی ریاستیں کہ جہاں جمہوریت کا نام و نشان نہیں ہے' وہاں یا تو بادشاہتیں ہیں یا آمرانہ اور فوجی حکومتیں' لہذا یہ ان کے مفاد میں ہے کہ وہ مذہب کے نام پر علماء کی حمایت کریں تاکہ انہیں عوام کی نظروں میں جائز و قانونی حکومت کی سند مل جائے۔ یہاں پر ان حکومتوں اور علماء کے مفادات ایک ہو جاتے ہیں' کیونکہ دونوں جدیدیت اور تبدیلی کے رجحانات کو اپنے لئے خطرناک سمجھتے ہیں' اور انہیں مذہب کا نام لے کر روکنا چاہتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی میں اس کے خلاف مصطفی کمال پاشا نے عملی قدم اٹھایا تھا اور خلافت و سلطنت کے تمام نشانات کو مٹا کر علماء کے اقتدار کو ختم کر کے سیکولر ترکی کی بنیاد ڈالی تھی کہ جو اب تک کسی نہ کسی شکل میں چل رہی ہے۔ اس کی اس



پھر انہوں نے عربی ثقافت کے مقابلہ میں اپنی ثقافتی برتری پر زور دیا' اور اسی لئے انہوں نے مولانا رومی کی مثنوی کو "قرآن در زبان پہلوی" کہا' ایرانی دانشوروں نے قدیم ایران کی شان و شوکت کا احیاء کرکے اس میں اپنی شناخت تلاش کی۔ اس طرح مسلمان ہوتے ہوئے بھی عرب اور ایرانی دو علیحدہ قومیں رہیں۔

یہی عمل دوسری اقوام اور نسلی جماعتوں میں ہوا کہ اسلام لانے کے بعد بھی انہوں نے اپنی ثقافتی روایات کو برقرار رکھا' اور انہیں اسلام کے ساتھ ضم کر دیا۔ اس وجہ سے اسلام' مختلف ثقافتی حالات میں ارتقاء پذیر ہوا' اور اس کی مناسبت سے اس کی شکل و ساخت بدلتی رہی۔ چنانچہ آج ہر اسلامی ملک میں اسلام مختلف ثقافتی شکل میں ہے' اور ہر ملک و قوم مذہب کے ایک ہونے کے باوجود علیحدہ سے اپنی شناخت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

جب نو آبادیاتی دور میں مسلمان ممالک یورپی ممکلوں کی نو آبادیات بنے تو اس کے خلاف جمال الدین افغانی نے پان اسلام ازم کے نام سے ایک تحریک چلائی جس کا مقصد یہ تھا کہ تمام مسلمان ممالک متحد ہو کر یورپی استعمار کے خلاف جدوجہد کریں۔ چونکہ اس وقت عثمانی حکومت کے زیر اقتدار مشرق وسطیٰ کے ممالک تھے' اس لئے اس کے لئے پان اسلام ازم کی تحریک مفید تھی' کیونکہ اس طرح سے عرب ممالک مغرب کے خلاف عثمانی حکومت کے حامی بن جاتے' لیکن یہ تحریک خود عرب ملکوں کے لئے کہ جو عثمانی حکومت کے ماتحت تھے اور اسے ایک نو آبادیاتی طاقت سمجھتے تھے' مفید نہیں تھی' اور اس کے ذریعہ وہ عثمانی حکومت کے اقتدار کو تسلیم کرنے پر مجبور تھے' اور اس کے خلاف کوئی مزاحمت نہیں کر سکتے تھے' کیونکہ وہ

مسلمان تھے اور خلیفہ کے خلاف بغاوت مذہب کے خلاف ہوتی' اس لئے انہوں نے پان اسلام ازم کو رد کر کے اس کی جگہ قوم پرستی کو اختیار کیا تا کہ تمام عربوں کو متحد کر کے عثمانی خلافت سے آزادی کی جنگ لڑ سکیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب مسلمان ممالک آزاد ہوئے تو انہوں نے یورپی طرز پر قومی ریاست کی تشکیل دی' اور اس طرح جغرافیائی طور پر مختلف اقوام وجود میں آئیں' قومیت کی تشکیل کے اس عمل میں مصری' عراقی' مراکشی' اور ایرانی علیحدہ علیحدہ شناخت رکھتے ہیں' اور ان کی مذہبی شناخت اس کے بعد آتی ہے۔

چونکہ ہر قوم کے اپنے مفادات ہوتے ہیں' اس لئے وہ ان کا تحفظ چاہتی ہے' اور ان مفادات کو قربان کر کے وہ اپنا نقصان کرنا نہیں چاہتی ہے' اس لئے جب مصر کے انور سادات نے دیکھا کہ مصر کا مفاد اسرائیل کو تسلیم کرنے میں ہے تو اس نے دوسرے مسلمان ممالک کے جذبات کی پرواہ نہیں کی' اور آج دوسرے عرب ممالک بھی اپنے مفادات کی خاطر اسرائیل کو تسلیم کرنے پر تیار ہیں' اور اس سلسلہ میں انہیں فلسطین کے عوام کی کوئی پرواہ نہیں۔

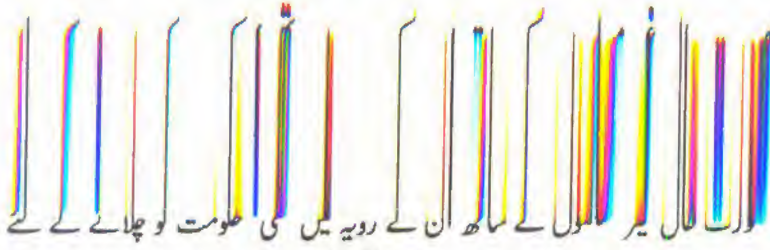
اس لئے جہاں تک مسلم امہ کا سوال ہے یہ صرف ہمارے ذہنوں اور تصورات میں ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ نہ آج ہے اور نہ ہی ماضی میں اس کا کوئی وجود تھا۔

انتخاب

اسلامی معاشرے کی تاریخ میں ہمیں تین رجحانات ملتے ہیں: شریعت' طریقت' اور روشن خیالی۔ علماء نے ابتداء ہی سے حکومت میں شمولیت کے ذریعہ یا حکومت سے باہر رہتے ہوئے اس بات کی کوشش کی کہ اسلامی معاشرے میں شریعت کا نفاذ ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ان کا رویہ ہمیشہ سے متشدد رہا اور انہوں نے طاقت و جبر کے ذریعہ شرعی قوانین کا نفاذ چاہا۔ چونکہ علماء کا ذہن ایک خاص فریم ورک میں تھا اس لئے وہ اس سے باہر نکلنے پر تیار نہیں تھے' اور وقت کی تبدیلیوں' نئے تقاضوں' اور چیلنجوں سے واقف نہیں تھے اس وجہ سے حکمرانوں اور ان کے درمیان عملی طور پر اختلاف رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکمرانوں کی ذمہ داریاں بالکل مختلف تھیں' حکومت کو قائم رکھنے اور رعیت کی خوش حالی' اور ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے انہیں ایسے اقدامات لینے پڑتے تھے کہ جو شریعت کے خلاف ہوتے تھے۔ اس لئے انہوں نے علماء کے ساتھ مفاہمت کا راستہ اختیار کر لیا تھا اور وہ یہ تھا کہ مذہبی معاملات میں انہیں اختیارات دے دیئے تھے' مگر سیاسی امور میں انہوں نے اپنی حاکمیت کو برقرار رکھا' مثلاً علاء الدین نے باغیوں کو سخت سزائیں دیں اور جب اس کے دربار کے عالم قاضی مغیث نے ان سزاؤں کو شریعت کے خلاف کہا تو اس نے اس سے اختلاف کیا' کیونکہ اس کے نقطہ نظر سے بغاوتوں کے خاتمہ کے لئے ان سزاؤں پر عمل ہونا ضروری تھا۔

اس لئے بادشاہوں نے اپنی شان و شوکت اور دبدبہ کے لئے ایرانی نظریہ

بادشاہت کو اختیار کر لیا' اور اس معاملہ میں شریعت کی کوئی پرواہ نہیں کی' یہی



ورت حال غیر مسلموں کے ساتھ ان کے رویہ میں تھی حکومت کو چلانے کے لئے

اگر انہیں اپنی غیر مسلم رعایا کی ضرورت ہوتی تو اسے انہوں نے اختیار کیا' اور انہیں حکومت اور اقتدار میں شریک بھی کیا۔ ہندوستان میں مسلمان حکمران اس لئے کامیابی سے حکومت کر سکے کہ انہوں نے علماء کی راہنمائی کے بجائے کلی طور پر حکمرانی کے طریقوں کو استعمال کیا' اور اس لحاظ سے اپنی حکومت کو سیکولر بنیادوں پر استوار کیا' اس لئے جن حکمرانوں نے اس سے انحراف کیا' ان کے زمانہ میں ملک سیاسی بحرانوں کا شکار ہوا۔ مثلاً فیروز شاہ تغلق' اور اورنگ زیب نے جب جزیہ کو نافذ کیا تو اس نے معاشرہ میں ہیجان اور انتشار پیدا کیا' اور اس کا نتیجہ سیاسی تباہی کی صورت میں ہوا۔

ہندوستان کے دو بڑے حکمرانوں میں جن میں علاء الدین اور اکبر کے نام قابل ذکر ہیں' انہوں نے واضح طور پر شریعت کو مسترد کرکے اپنی پالیسی عملی تقاضوں کے تحت تشکیل دی' اور یہی وجہ تھی کہ ان کے دور حکومت میں جو استحکام اور خوش حالی و امن و امان تھا وہ کسی اور زمانہ میں نہیں تھا' انہوں نے خصوصیت سے علماء کے اثر و رسوخ کو بالکل ختم کر دیا اور سلطنت کو خالص سیاسی بنیادوں پر چلایا۔ دوسرے حکمرانوں نے اس کے بجائے یہ راستہ اختیار کیا کہ ان سے مفاہمت رکھی' مگر انہیں سیاسی معاملات میں دخل نہیں دینے دیا۔

مگر علماء ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ انتشار کا باعث رہے' ان کی یہ کوشش رہی کہ وہ مذہب کو سیاست پر غالب کر دیں' اس لئے انہیں جب بھی موقع ملا انہوں نے حکومت کی تشکیل میں حصہ لیا۔ چونکہ قرون وسطی میں بادشاہ کی ذات ہی سب کچھ

ہوتی تھی اس لئے یہ سمجھا جاتا تھا کہ اگر مذہبی خیالات کے حامل کو بادشاہ بنا دیا جائے تو وہ پورے معاشرے کو اسی طرح سے ڈھال لے گا۔ اس لئے یہ علماء جب محمد تغلق اس کی اصلاحات اور اس کے مذہبی خیالات سے تنگ ہوئے تو انہوں نے اس کے خلاف بغاوتوں میں بھرپور حصہ لیا اور اس کی وفات کے بعد فیروز تغلق کو اس لئے بادشاہ بنانے میں مدد دی کہ وہ ان کی پالیسیوں کو نافذ کرے گا۔ لیکن چند بادشاہوں کے، علماء کو حکومت و ریاست میں کبھی بھی غلبہ نہیں ہو سکا، کیونکہ حکمرانوں کو حکومت چلانے کے لئے جس رواداری کی ضرورت تھی، وہ علماء میں مفقود تھی۔

یہ ضرور ہوا کہ علماء کی وجہ سے حکمرانوں کو اکثر پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، ایک اہم وجہ جس کی وجہ سے مذہبی فسادات اور فرقہ وارانہ فضا پیدا ہوتی تھی وہ علماء کا جذبہ تبلیغ تھا، اور جب وہ اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے کسی کو جبراً" مسلمان بنا لیتے، تو اس صورت میں ہندوؤں میں تناؤ بڑھ جاتا تھا۔ مثلاً ۱۶۶۹ء میں سورت شہر میں قاضی نے اس بات کی کوشش کی کہ وہاں کے تاجروں کو مسلمان کرے۔ ان کے مندروں کو ڈھائے، اس نے ایک ہندو منشی کی زبردستی ختنہ بھی کروا ڈالی۔ اس کی وجہ سے سورت کے ہندو تاجروں اور عام ہندو آبادی میں زبردست ہراس پھیل گیا، احتجاج کے طور پر تاجروں نے دکانیں بند کر دیں اور سورت شہر چھوڑ کر دوسرے شہر چلے گئے اور ساتھ ہی میں اورنگ زیب کو خط کے ذریعہ تمام تفصیل لکھی، اس پر بادشاہ نے قاضی کی سرزنش کی، اور تاجروں کو یقین دلایا کہ ان پر زبردستی نہیں کی جائے گی۔

لوگوں کو جبراً مسلمان بنانا، ہندو عورت کو بھگا کر اس سے شادی کرنا اور پھر اسے مسلمان بنانا، ان کے نئے مندروں کو ڈھانا، یہ وہ وجوہات تھیں جو مذہبی نفرت و فرقہ

واریت کو پیدا کرتی تھیں' اور اس صورت حال میں سیاسی طور پر انتظامیہ کے لئے



مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں کہ وہ کس طرح سے امن و امان کو بحال کریں اگرچہ اکثر معاملات میں انتظامیہ مذہبی جذبات سے دور رہ کر خالص سیاسی نقطہ نظر سے فیصلے کرتی تھی۔ مگر کبھی کبھی مذہبی تعصبات آ جاتے تھے جو معاشرے میں مذہبی نفرتوں کو پیدا کرتے تھے۔

اسی چیز کو ذہن میں رکھتے ہوئے مسلمان حکمرانوں نے ہندوستان میں کبھی بھی تبلیغ کی سرکاری طور پر سرپرستی نہیں کی' اور اس بات کی کوشش کی کہ ہندوؤں کے مذہبی معاملات میں بھی کوئی دخل نہیں دیا جائے۔

اسلامی معاشرے میں علماء کے اس تشدد' تنگ نظری' اور جبر کے خلاف صوفیاء نے بغاوت کی جنھوں نے شریعت کے مقابلہ میں طریقت کو اختیار کیا کہ جس میں سختی و جبر کے بجائے رواداری اور قوت برداشت تھی۔ مگر ایک لحاظ سے صوفیاء نے شریعت اور اس کے نظام سے بغاوت نہیں کی بلکہ اس نظام سے ہٹ کر اور اسے تبدیل کئے بغیر ایک متبادل نظام قائم کیا کہ جو لوگوں کو اس تناؤ اور کھنچاؤ سے نجات دے کر انہیں پناہ گاہ فراہم کرتا تھا' مگر انہوں نے نہ تو سیاسی نظام سے ٹکر لی اور نہ شریعت کی سختی پر تنقید کی' بلکہ ان سے علیحدہ ہو کر اپنی پناہ گاہیں تعمیر کر لیں کہ جو لوگوں کو وقتی طور پر سکون تو دے دیتی تھیں' مگر یہ معاشرہ کی زندگی میں کوئی تبدیلی لانے میں ناکام رہیں۔

چونکہ صوفیاء علماء کے نظام سے علیحدہ ہو گئے تھے اس لئے یہ انہیں اپنا حریف اور رقیب سمجھتے تھے اور ان کی عوامی مقبولیت کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس لئے جب بھی انہیں موقع ملتا تو یہ ان پر تنقید کرنے اور سزا دینے سے نہیں

چوکتے تھے' یہ ان کے طریقہ زندگی کو شریعت کے خلاف سمجھتے تھے' اسی لئے انہوں نے صوفیاء پر اعتراض کیا کہ وہ سماع کی محفلیں منعقد کر کے شریعت کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ لیکن یہ ان کے خلاف کوئی جارحانہ اقدامات اس لئے نہیں کر سکے' کیونکہ ایک تو ان کے ساتھ یہ عقیدہ منسوب تھا کہ ان کے پاس روحانی قوت ہے' اور جو ان کو نقصان پہنچائے گا وہ اس کی سزا پائے گا دوسرے ان کی عوام میں مقبولیت تھی' اور اس لئے حکمراں و علماء ایسا کوئی قدم اٹھانے پر تیار نہیں تھے کہ جن سے ان کی مقبولیت کو نقصان پہنچے۔

شریعت و طریقت کے ساتھ تیسرا راستہ روشن خیالی' رواداری اور عقلیت کا تھا' اسلامی معاشرے میں ایسے دانشوروں کی تعداد ہمیشہ سے کم رہی ہے جو ان نظریات کی تبلیغ کرتے اور ان میں بھی وہی لوگ کچھ کر سکے کہ جن کی سرپرستی کسی حکمراں نے کی' اگر ابوالفضل کو اکبر نہیں ملتا تو یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنے خیالات کا پرچار کر سکتا' اکبر کے دربار میں ایسے دانشور اکٹھے ہو گئے تھے جو پھر کبھی کسی حکمراں کے دربار میں جمع نہیں ہو سکے۔ اور یہ اکبر کی صلح کل اور رواداری کی پالیسی تھی کہ جس نے مغل حکومت کو مستحکم بنیادوں پر استوار کیا۔

موجودہ دور میں اسلامی ممالک اور خاص طور سے پاکستان جس صورت حال سے دوچار ہے اس میں ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخ کے تجربات کے بعد وہ اپنا انتخاب کرے کہ کیا اسے علماء کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر پس ماندگی اور رجعت پرستی کی طرف جانا ہے یا موجودہ حالات کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے جمہوریت' سیکولرازم' اور صنعتی ترقی و روشن خیالی کو اختیار کرنا؟ پوری اسلامی تاریخ میں جب کبھی بھی حکومت پر علماء کا غلبہ ہوا اس کے نتیجہ میں معاشرہ کو نقصانات اٹھانا پڑے'



کا اقتدار ہے۔ شریعت کا نفاذ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی بے انتہا دولت کے باوجود اقوام عالم میں کوئی با عزت مقام پیدا نہیں کر سکے' اس کی وجہ یہ ہے کہ علماء کے متشدد رویہ اور تنگ نظری کی وجہ سے سعودی معاشرہ ایک ایسا معاشرہ ہے کہ جس میں کوئی ثقافت نہیں' انھوں نے ادب' شاعری' موسیقی' مصوری' رقص' ادب و آداب' کسی میں بھی کوئی تخلیقی کام سر انجام نہیں دیا۔ ذہنی طور پر وہ ایک بنجر اور ویران معاشرہ ہے کہ جہاں نہ تو عورت کی کوئی عزت ہے نہ وقار' اور نہ ہی جہاں انسانی حقوق کا کوئی پاس ہے۔ سعودی اور غیر سعودی کی تفریق نے اس معاشرہ کو جنوبی افریقہ سے زیادہ بدتر بنا دیا ہے۔ تمام قانون ایک سعودی شہری کے ساتھ ہیں اور غیر سعودی تمام مجرموں سے زیادہ بدتر ہیں اور جب سعودی امراء اس گھٹن سے فرار ہو کر یورپ اور ایشیا کے ملکوں میں عیاشی کے لئے جاتے ہیں تو وہ انتہائی گھٹیا ذہنت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اس طرح دوسرے اسلامی ملکوں میں اسلام کا استعمال محض سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے' جب سوڈان میں نمیری نے اپنی آمریت کو برقرار رکھنے کے تمام حیلے ختم کر چکا تھا تو اس نے اسلامی سزاؤں کے ذریعہ اپنی حکومت کی مدت وسیع کرنی چاہی' اور اب وہی کچھ معمر قذافی لیبیا میں کر رہا ہے۔ اپنے جبر و تشدد کی ناکامی کے بعد وہ بھی اسلامی سزاؤں میں پناہ لے رہا ہے' تاکہ اس طرح اپنے مظالم کو اسلامی رنگ دیا جا سکے۔

پاکستان میں بھٹو سے لے کر ضیاء الحق' اور موجودہ حکمران اپنے سیاسی مقاصد کے لئے اسلام کو استعمال کر رہے ہیں' اور اس طرح ملک کو مزید ٹکڑے ٹکڑے

کرنے میں مصروف ہیں' مذہبی اقلیتوں کے ساتھ ناروا سلوک' معاشی امور میں علماء کی رائے' اور سیاسی مسائل میں ان کے مشورے ملک میں بحران پیدا کر چکے ہیں' اس کے نتیجہ میں نہ تو پاکستانی قوم کا کوئی وجود عمل میں آسکا اور نہ ہی بحیثیت مسلمان کے مسلم امہ کی کوئی تشکیل ہو سکی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک قوم کی تشکیل' قومی ریاست کی بنیادوں پر ہو کہ جس میں بلا تفریق مذہب سب شریک ہوں' ملک کے سیاسی و معاشی مسائل زمانہ کی ضرورت اور تقاضوں کے مطابق ہوں۔ ثقافتی سرگرمیوں کا فروغ ہو تاکہ معاشرہ سے تشدد' بربریت' اور کھچاؤ ختم ہو' جمہوری نظام اس طرح سے نافذ ہو کہ جس میں عوام کی طاقت ابھر کر آئے اور جاگیرداری تسلط و غلبہ کا خاتمہ ہو' لوگ اپنے راہنما کا احتساب کر سکیں' اور ان کی غلطیوں کی سرزنش کر سکیں۔ یہ ایک یوٹوپیائی معاشرہ کا خاکہ نہیں بلکہ ایسا معاشرہ ہے کہ حقیقت میں بہت سے ملکوں میں قائم ہے' اور یہ ملک ہمارے لئے یہ ماڈل فراہم کر رہے ہیں' محض سوال ہمارے انتخاب کا ہے۔ کیا ہمیں اس قسم کا معاشرہ قائم کرنے کی کوئی خواہش ہے؟

کتابیات

عبدالقادر بدایونی: منتخب التواریخ۔ کلکتہ 1868ء

ابو الحسن الماوردی: الاحکام السطانیہ (اردو ترجمہ) نفیس اکیڈمی، کراچی 1968ء

نظام الملک طوسی: سیاست نامہ (اردو ترجمہ) نفیس اکیڈمی، کراچی (؟)

مالک رام: (مرتب) خطبات ابوالکلام آزاد۔ اردو بازار لاہور (؟)

Ahmad, Aziz (edited): Religion and Society in Pakistan. Leiden 1971

Bashir, Ahmad: Akbar The Great. Lahore 1967.

Cantwell,c.w.s.: The Ulama in the Indian Politics. In: C.H.Philips: Politics and Society in India. London 1963.

Haq, Mushir: Muslim Politics in Modern India.Meerut 1970.

Lapidus, Ira M: A History of Islamic Societies. Cambridge 1991.

Metcalf, B.D: Islamic Revival in British India: Deoband 1860-1900 Prianceton 1982.

Nanda, B.R: Gandhi: Pan-Islamism, Imperialism and Nationalism. Oxfrd 1989.

Report of the Court Inquiry (Muneer Report) Lahore 1954.

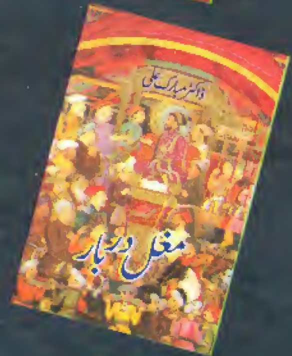
Rizvi, S.A.A: Shah Abdul Aziz. Canberra 1982.

Robinson, Francis: Separatism among Indian Muslims. Cambridge 1979.

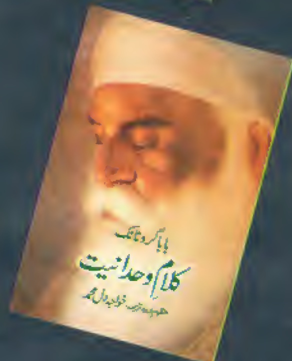














فکشن ہاؤس
18- مزنگ روڈ لاہور
E-mail: fictionhouse2004@hotmail.com
Ph:042-7249218, 7237430